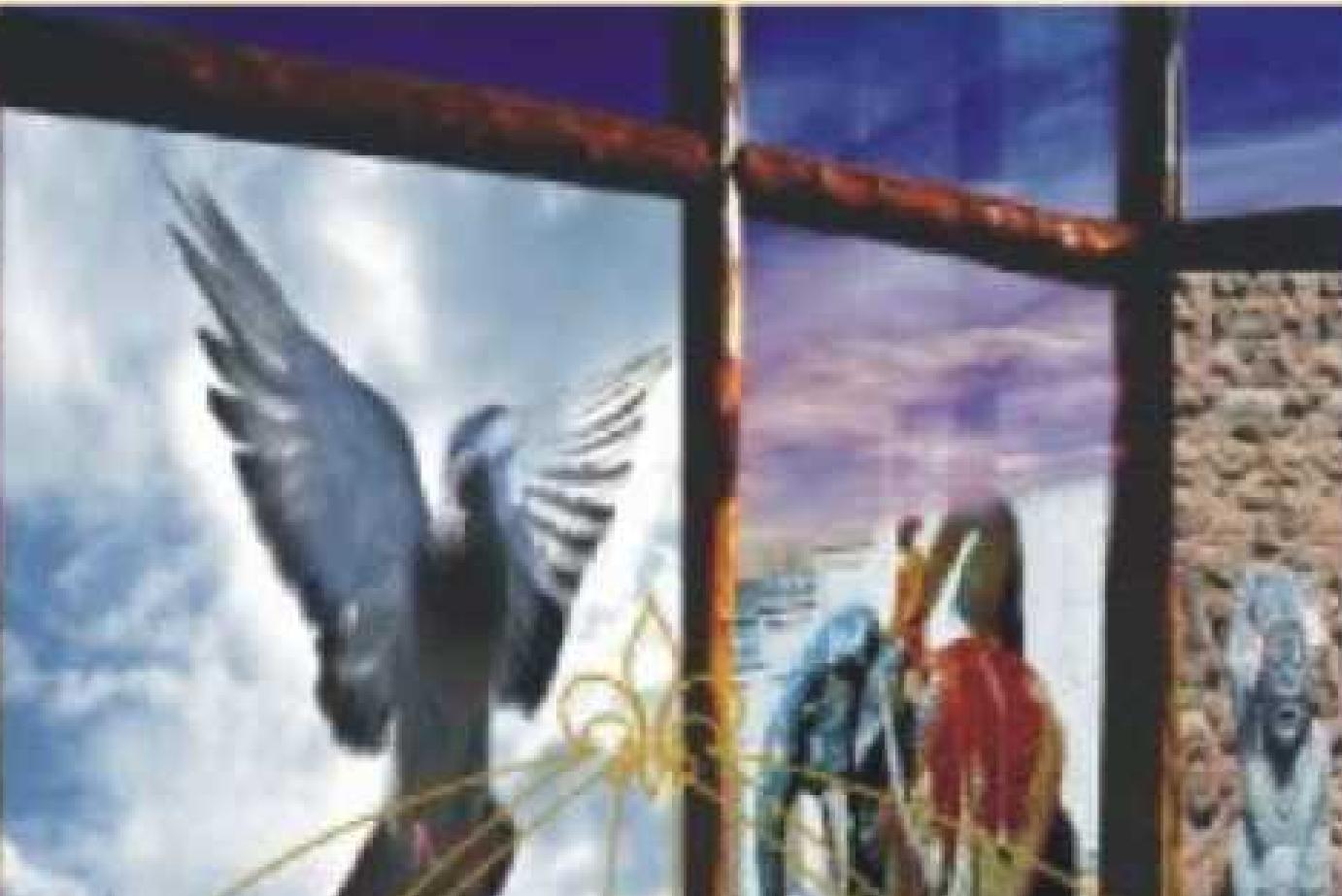


انتظارِ حسین

# حالي پچھرہ



## چچھتاوا

ما دھو پیدا ہو کر بہت چچھتا یا۔ مگر اب چچھتائے سے کیا ہوتا تھا۔ پیدا تو وہ ہو چکا تھا۔ اصل میں وہ ماں کے بھرے میں آگیا۔ عجیب بات ہے کہ ماں ہی کی باتوں سے اس کے اندر یہ بات بیٹھ گئی کہ آدمی کو پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے اور ماں ہی کی باتوں میں آ کر وہ پیدا ہونے پر رضا مند ہو گیا۔ اسی چچھتاوے میں جب وہ اپنے سارے اگلے پچھلے کو کرید رہا تھا دھیرے دھیرے کر کے اس پر یہ بات کھلی کہ بس وہ سوال کر کے بھنس گیا۔ ساری خرابی اس سوال سے پیدا ہوئی۔ مگر سوال اس نے ایسا کون سا بھاری کیا تھا۔ اتنا ہی تو پوچھا تھا کہ ماں تو دن رات کڑھتی کیوں رہتی ہے۔ ماں نے دکھی ہو کر کہا کہ میرے لال تو تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ ماں کے پیٹ میں نچخت بیٹھا ہے۔ جب خیر سے تجھے جنوں گی اور تو آنکھیں کھول کر اس دنیا کو دیکھے گا تو پھر تجھے پتے چلے گا کہ یاں پہ کتنے دکھرے بکھیرے ہیں۔

”دکھرے بکھیرے جا گئیں بھاڑ میں۔ ماں، تو سکھی رہا کر۔“

”لال، مجھہ دکھیا کے بھاگ میں تو دکھ لکھے ہیں۔“

”اور سکھ؟“

”سکھ۔“ رکنی نے خندہ انس بھرا ”سکھ یاں کہاں ہے۔“

وہ یہ بات سن کر بہت بیکل ہوا۔ پوچھا ”ماں، تو یہ کیا کہہ رہی ہے۔ سکھ کیا دنیا میں ناپید ہے۔ آخر کمیں تو ہو گا۔“

”میرے لال، سکھ ماں کی کوکھ تک ہے۔ آگے دکھی دکھ ہے۔“

”ماں، پھر لوگ پیدا کیوں ہوئے چلے جارہے ہیں۔“

”مور کھ جو ہوئے۔ ہبڑ دبڑ پیدا ہوئے چلے جارہے ہیں۔ پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی جان کو رو تے ہیں۔“

”پھر پیدا ہونے اور جینے میں کیا فائدہ ہے۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔ گھانا ہی گھانا ہے۔“

ما دھو ماں کی باتیں سن کر وہا میں پڑ گیا۔ ایک سوال نے اسے آپڑا کہ پیدا ہوا جائے یا نہ ہوا جائے۔ بہت او حیر بن کے بعد

آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ سوچا کہ چلو اچھا ہوا مال کے پیٹھی میں اصلی بات کا پتہ چل گیا۔ بھی تو تیر کمان میں ہے۔ میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ گھائے کا سودا میں کیوں کروں۔

رکنی بھولی بھالی عورت تھی۔ اسے پڑھی نہ چلا کہ اس کی کھوکھ میں کیا گل کھلا ہے۔ اور ہونے والا کیا سوچ رہا ہے۔ آسون مرادوں کے ساتھ اس نے نومینے پورے کئے اور بچھ جنے کے لئے تیار ہوئی۔ مگر بچھ نے تنہ وقت پہ پیدا ہونے سے انکار کر دیا۔ رکنی تو پیٹھ پکڑ کر بیٹھ گئی کہ یہ کیا ہوا۔ اس بات کا تو اسے سان گمان بھی نہیں تھا۔ ہوش ذرا غمکانے آئے تو بولی ”میرے لال، یہ تیرے جی میں کیا سماں ہے۔ یہ تو انہوںی بات ہے جو بالک پیٹھ میں آگ کیا سے پیدا بھی ہوتا ہوتا ہے۔ مال کی کوکھ تو بالک کو بس نومینے تک سنبھاتی ہے میں نے نومینے پورے کر لئے سو میرے لال جی اب تم باہر آ جاؤ، آنکھیں کھولو اور دنیا کو دیکھو۔“  
”نہیں مال، میں اس اندر ہی نہیں میں جہاں دکھتی دکھتے ہے آنکھیں نہیں کھولوں گا، چاہے میری ساری عمر تیری کوکھ میں پڑے پڑے بیت جائے۔“

رکنی نے بہت سمجھایا جھایا۔ مگر بالک اپنی ہٹ پا آ گیا تھا۔ کوکھ میں دھرنادے کے بیٹھ گیا۔

جب بہت دن بیت گئے اور رکنی اتنی بھاری ہو گئی کہ انھنا بیٹھنا اس کے لئے دو بھر ہو گیا جو پھر اس نے پتی سے رو رو کے کہا ”بچ کا بوجھ مجھے لے بیٹھے گا۔“

”کنپت پتی کی تکلیف دیکھ کر بیکل ہو گیا۔ کہا“ وید جی سے جا کے کہتا ہوں۔ وہ کوئی دارو کریں گے۔“

”وید جی کی دارو کیا کام دے گی جب بالک ہی پیدا ہونے پر راضی نہیں ہے۔“

کنپت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ چکرا کر پتی کو دیکھنے لگا۔

رکنی نے کہا ”سوامی اسے سمجھاؤ۔“

”کسے سمجھاؤں۔“

”اپنے بالک کو۔“

”بالک کو؟..... وہ تو پیٹھ میں ہے۔“

”یہی تو اسے سمجھانا ہے کہ پیٹھ میں بہت رہ لیا۔ اب باہر نکلے۔“

”اری کچھ تیری مت ماری گئی ہے۔ کیسی بیکی بھلکی با تینیں کر رہی ہے۔“

”سوائی میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تمہارا بالک پیدا ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ زرالا بالک ہے۔ پیٹ میں دھرنادے کے بیٹھ گیا ہے پیدا ہونے سے انکار کرتا ہے۔“

گنپت بہت چکرایا۔ پہلے تو اس نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا مگر جب رکنی نے ماڈھوکی باتیں سنائیں تو سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے دیدوں پر انوں کو بہت چھانا تھا۔ دھیرے دھیرے کر کے بات اس کی سمجھیں آگئی۔ سوچ کر بولا ”ہے تو یہ انوکھی بات۔ پرسوچ تو اتنی انوکھی بھی نہیں۔ گامدنی نے بھی اسی پر کار پیدا ہونے سے انکار کر دیا تھا۔“

رکنی نے چکرا کر پوچھا ”گامدنی کون تھی؟“

”گامدنی درشنی کے پتر شپلھک کی پتری تھی۔ ماں کے پیٹ میں اڑ کے بیٹھ گئی۔ مینے چڑھے پھر برس چڑھا۔ پھر دوسرا برس چڑھا۔ پھر تیسرا برس آن لگا۔ پتری تھی کہ پیٹ میں پھرتی تھی، پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کہتی تھی کہ مجھے پیدا ہونا ہی نہیں ہے۔“

”پھر کیا ہوا۔ پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔“

”پیدا کیسے نہ ہوتی۔ پیدا تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ جو بچہ پیٹ میں آگیا وہ بھاگ کے کھاں جائے گا۔ پیدا ہوئے ہی ہوئے پر اس نے ستایا بہت۔ پیدا ہونے کے لئے شرطیں رکھنی شروع کر دیں۔“  
”وہ کیا شرطیں تھیں۔“

”شرط بس ایک تھی۔ اسی پر اڑی ہوئی تھی۔ پتا نے کہا کہ پتری پیر مت پھیلا۔ بس یہ تیری ماتا کی کوکھ ہے، وشنو بھی کاوشال پیٹ نہیں ہے۔ میرا کھامان اور پیدا ہو جا۔ وہ بولی، ایک شرط میں جنموں گی۔ پوچھا دہ کیا شرط ہے۔ کہا میں روز ایک گیا برہمنوں کو دان دیا کروں گی۔ یہ شرط پوری کرنے کا وچن دو تو پھر میں جنموں گی۔ پتا نے کہا، چل تیرا کھامان لیا۔ اب دیر مت کر۔ پیدا ہو جا۔ بس وہ ترنہت ہی پیدا ہو گئی۔ اور پیدا ہوتے ہی گھر میں بندھی ہوئی گئیں دان دینی شروع کر دیں۔“

رکنی نے کہا ”اپنے ماڈھو سے بھی پوچھ لو کہ اس کی کیا شرط ہے۔ جو شرط رکھے مان لو۔ مجھ سے اب اسے سہارا نہیں جاتا۔ گنپت نے بیٹے کو پکارا ”پتری ماں کا پیٹ ہے۔ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔ بہت ہو چکی، اب پیدا ہو جاؤ۔ خود بھی جیو ماں کو بھی جینے دو۔“

ماڈھو نے کوکھ میں لیٹے لیٹے پکار کے کہا ”پتا جی، پیدا ہو کے میں کیا لوں گا۔ پیدا ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ جیون میں تو دکھا ہی دکھ ہے۔“  
گنپت بیٹے کے اس جواب پر اتنا سامنے لے کر رہ گیا۔ رکنی سے بولا ”اری بھاگوں بھری تیرے پوت کے تو گومز لال والے

چھن ہیں۔

رکنی نے پوچھا۔ ”سوامی گومرال کون تھا۔ اور اس کے کیا چھن تھے۔“

”گومرال پراچین کال میں ایک ودھوان کا پتہ تھا۔ وہ ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ باپ سے ودیا میں برابری کرنے لگا۔ باپ جو بات کہتا یہ اس سے جرح کرنے لگتا۔ ایک دن باپ کو تاؤ آگیا کہ میں اتنا بڑا ودھوان اور یہ ذیرہ باشت کا چھوکر ابھی ماں کے پیٹ میں ہے اور مجھ سے بحث کرتا ہے۔ اسی تاؤ میں پتی کی کوکھ پر لات ماری۔ لات سیدھی بالک کے سر پر پڑی۔ چوت سے اس کے سر پر گومر پڑ گیا۔ اسی سے وہ گومرال کھلانے لگا۔“

”پر وہ پیدا تو ہو گیا تھا؟“

”پیدا تو وہ اپنے سے سے پہلے ہی ہو گیا اور ایسا پیدا ہوا کہ ویدوں کا درن کرتا پیٹ سے نکلا۔ باپ کہیں جیتا ہوتا تو اس کی ودیا کے سامنے پانی بھرتا۔ پر اس کا تو پہلے ہی دیرہانت ہو چکا تھا۔ ہوا یوں کہ وہ راج دربار کے چاڑو ودھوانوں کے چکر میں آگیا اور ان سے مات کھا گیا۔ یہ ہمارے کھائی۔ ندی میں جا کے ڈوب مرا۔ گومر جب سیانا ہوا تو ماں نے اسے بتایا کہ تیرے پتا کے ساتھ کیا ہوا۔ اس نے آؤ دیکھانہ تاؤ سیدھا راج دربار میں جادھم کالکارا کر میں ان چاڑو ودھوانوں سے بحث کروں گا جو میرے پتا کی موت کا کارن بنے ہیں۔ راجہ نے کہا کہ بالک ہاتھیوں سے گئے مت کھا۔ تو ابھی کچی دھات ہے۔ یہ میرے دربار کے رتن اپنے ہنر میں مجھے ہوئے ہیں۔ پر گومرال ایک ایک پانی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ایک ایک پانی کر کے مانا۔ راج دربار کے ودھوانوں نے ناک رگڑی اور ہار مان لی۔“

رکنی یہ کہانی سن کر بولی کہ پتا کا اس نے اپمان کیا۔ پر پیدا تو ہو گیا۔ تمہارا لاؤ تو پیدا ہونے ہی کے لئے تیار نہیں۔ ارے اسے کسی پر کار ہونے پر راضی کرو۔“

”بھاگوں بھری میں اسے کیسے راضی کروں۔ اس نے ایسا سوال کر ڈالا ہے۔ جس کا جواب میرے پاس تو ہے نہیں۔ پوچھتا ہے کہ پیدا ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ بھلا میں اس کا کیا جواب دوں۔ اس کا جواب تورشیوں منیوں کے پاس بھی نہیں ہے۔“

”اچھا میں اس کرم جلتے کی بات کا جواب دیتی ہوں۔ وہ جمل بھن کر بولی اور پھر اپنی کوکھ والے سے مخاطب ہوئی۔ ”بالک بتا تو نے اپنے باپ سے کیا پوچھا تھا۔“

”ماں میں نے باپ سے یہ پوچھا تھا کہ پیدا ہونے کا آخر فائدہ کیا ہے۔“

”مورکھ میں تجھے بتاتی ہوں کہ پیدا ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ میرا پنڈ تجھ سے چھوٹ جائے گا اور میرے پیٹ کا بوجھ بلا کا ہو جائے گا۔“

اس بات پر ماڈھو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کچھ بن نہ پڑا کہ ماں کی بات کا کیا جواب دے۔ بس پیدا ہو گیا۔ مگر عجیب ہوا اور اس نے آنکھ کھولی اور ماں کی آنکھ بند ہو گئی۔ جیسے وہ اسے جننے ہی کے لئے جینے کا کشت کھینچ رہی تھی۔

گپت کو رکنی سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ دنیا سے سدھارنی تو وہ بھی ڈھنپا چلا گیا۔ دنوں میں وہ چٹ پٹ ہو گیا۔ ماڈھو دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا تو بالک پر سیانوں سے زیادہ سیانا تھا۔ ماں باپ کی موت پر اس نے جتنا شوک کیا اس سے زیادہ سوچ بچار کیا۔ رہ رہ کر سوچتا کہ اس کے جنم لینے کے ساتھ ہی ماتا پتا دنوں تکھنٹ کولد گئے۔ آخر کیوں۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ جانا کہ وہ دنوں اسی کے کارن دنیا سے سدھارے۔ نہ وہ دنیا میں آتا نہ وہ دنوں دنیا سے جاتے۔ ایک جیو آیا اور دو جیو چلے گئے۔ اور جیو بھی کیسے۔ گپت اور رکنی جیسے کہ دنوں ہیرا تھے۔ اور میں؟ میں تو ان کے سامنے روزا ہوں اور اب ان کے بنا تو بالکل ہی گلی کار روزا بن جاؤں گا۔ ماں نے سچ ہی کہا تھا کہ اس جگ کا جیوں گھانے کا سودا ہے اور وہ پھٹکلا یا کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا۔ اگر میں ماں کی بات کا اثر نہ لیتا اور پیدا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ پیدا نہ ہونے کا اچھا بھلا فیصلہ کر کے ماں کے بھرے میں آگیا اور خواہ بخواہ پیدا ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ کیسا ہی گھاؤ ہو وقت اسے بھردیتا ہے۔ مگر کیسا گھاؤ تھا کہ جتنا وقت گزرتا چلا جاتا تھا اتنا گھرا ہوتا جاتا تھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر کنبہ کے لوگ ایک دن اکٹھے ہو کر اس کے پاس آئے اور سمجھانے لگئے کہ ماتا پتا کسی کے بھی سدا نہیں رہتے اور آنا جانا تو اس دنیا میں لگا ہی رہتا ہے۔ اب اس گھٹنا کو بہت دن بیت گئے ہیں اور تم سیانے ہو گئے ہو۔ مگر میں داتا کا دیا سب کچھ ہے۔ تمہارا پتا دھن دولت چھوڑ کے دنیا سے گیا ہے۔ بیاہ کرو اور گھر آباو کرو۔“

”میں خود دکھی ہوں۔ مگر میں کسی دوسرا جیو کو لا کر کیوں دکھی کروں۔“

”ارے بھاگوان، تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ آنے والی آئے گی تو بھی اور سا ہو گا اور دکھ بہت جائے گا۔“ اور کنبہ کے ایک بڑے نے یہ کہا کہ ”اللہ دکھ اس اسار سنوار میں اتنا ہے کہ کوئی اکیلی جان اسے سہار نہیں سکتی۔ اسی کارن پیدا کرنے والے نے جیو کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے۔ دوسرا کی سنگت میں دکھ بہت جاتا ہے۔“

ماں ہونے کنہے والوں کی باتیں میں مگر ذرا جوٹ سے مس ہوا ہو۔ آخر میں اس نے یہی کہا کہ ”میں خود اپنے لئے بوجھ ہوں۔ میں اس بوجھ کو اتنا نے کو پھر رہا ہوں۔ بیاہ کر کے ایک اور بوجھ سر لیلوں۔ نہ بابا نہ۔“

کنہہ والوں کو یہ نکا سا جواب دے کر اس نے چلتا کیا۔ پھر سوچا کہ باپ کا چھوڑا ہوا و پیسہ پیسہ ذخیرہ ڈنگر کھیت مکان یہ بھی تو سب بوجھوئی ہیں۔ یہ کھڑاگ آخر کس لئے۔ بس اس نے ترت پھرت سب کچھ برہمنوں کو دان دے دیا، گایوں کو پن کر دیا۔ جیسے یہ سب کچھ خاک تھا کہ اس سے دامن جھاڑا اور انھوں کھڑا ہوا۔

باپ کی چھوڑی ہوئی ساری وہمن دولت دان پن کرنے کے بعد ما دھونے سوچا کہ بس اب ایک جنم بھار رہ گیا ہے۔ اسے بھی اتار دوں گا تو بالکل ہلاکا ہو جاؤں گا مگر کیسے اتاروں۔ اس چکر میں وہ گنگے سے نکل کھڑا ہوا۔ لئے دنوں تک گنگر گرا اور ڈگر ڈگر مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر تا پھر اتا ایک جنگل بیان میں جانکلا۔ دور دور تک آدمی نہ آدمزاد۔ پر تھوڑی دیر میں ایک ہرے بھرے پیڑا پر نظریں جم گئیں۔ اس کی چھاؤں میں اک ہری بھری ناری بیٹھی دھار روں دھار روہی تھی۔ اسے دیکھ کر من میں کن من کن ہونے لگی۔ پر فوراً ہی سنجھل گیا۔ سوچا کہ یہ تو میں ناری جاں میں پھنسنے لگا ہوں۔ اس سے کنی کاٹی اور قدم مارتا آگے نکل گیا۔ بہت آگے آیا تو پھر سنجھکا اس بن میں جہاں دور دور تک آدمی کا پتہ نہیں ہے۔ یہ ناری کیسے آئی اور کیوں رورہی ہے۔ ضرور اس پر کوئی پتہ پڑی ہے۔ اس سے مجھے پوچھ لیتا چاہئے کہ تجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے کہ یاں اکیلی بیٹھی ٹرٹر رہ رہی ہے۔ اگر میں اس کی کوئی مدد کر سکتا ہوں تو کرنی چاہئے۔ آخر آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ سوچو وہ جس تیزی سے کنی کاٹ کر آیا تھا اسی تیزی سے پلانا جا کر ناری سے پوچھا ”اے ناری تو کون ہے۔ آدمی کی پنچی ہے یا کوئی اپسرا ہے۔ اس ز جن بن میں تو کیا کر رہی ہے اور کیوں یوں بلک بلک کر رہی ہے۔“

ناری نے سراٹھا کرو دیکھا۔ روتے روتے قہم گئی جیسے اسے دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھ گئی ہو۔ آنسو پوچھے اور بولی ”تھی تو میں اپسرا ہی مگر اپنے پھونے بھاگوں سے اب ناری بن کر کشٹ کھینچ رہی ہوں۔“

”یہ کس کارن ہوا۔“

”ہوا یوں کہ اس بن میں ایک رشی تپ کر رہا تھا۔ اندر دیوتا اس کا تپ دیکھ کر وسو سے میں پڑ گیا۔ اپسراوں کو بلا کر کہا کہ یہ رشی بہت بڑھ چلا ہے۔ تپ کے زور پر دیوتا بننے کے جتن کر رہا ہے۔ کون اپسرا ہے جو اسے رجھا کر اس کے تپ میں بھنگ ڈالے۔ میں نے اپنے گھمنڈ میں کہا کہ میں جاتی ہوں۔ وہ بھاوہ بتاوں گی کہ رشی جی ساری تپ بھول جائیں گے۔ سو میں سند ناری بن کر اٹھلاتی بھاوہ بتاتی جو بن دکھاتی اس کے سامنے آئی۔ رشی نے میرے کھیل کوتاڑ لیا۔ لال پیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور شراپ دیا کہ اب تو اسی روپ میں رہے گی اور اسی بن میں خاک پھانکتی پھرے گی۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ رشی کے چڑنوں میں پڑ گئی۔ روئی گزگزائی کہ رشی جی چوک ہو گئی۔ شما کر دو۔ رشی مہاراج تھوڑے زم پڑے اور بولے کہ اب تو میں شراپ دے چکا ہوں۔ واپس نہیں لے سکتا۔ ہاں یہ

کر سکتا ہوں کہ سزا بھی نہ کھینچے۔ سون کہ اس بن میں جب کوئی جوان آئے گا اور تو اس سے ملے گی تو پھر تیرا اپسرا والا روپ واپس آئے گا اور تو اس بن کی قید سے چھکا را پائے گی۔“

ما دھونے اس کی یہ پتھاری تو اس کا دل پتیج گیا پھر جیران ہو کر پوچھا ”ناری تجھے کتنے دن ہو گئے یہ سزا بھگتتے۔“  
ٹھنڈا سانس بھر کر بولی ”مت پوچھ کر کتنے برسوں سے یہ کشت کھینچ رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ شتابدی بیت گئی۔“  
”اس دن سے ادھر کوئی جوان آیا ہی نہیں۔“

”جو ان یاں کہاں دکھائی دیتا ہے۔“ اس نے پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”سفید سن ایسی جٹا بھیں بڑھائے بڑھے پھونس رشی یہاں پہ آتے ہیں۔ سادھی لگا کر آنکھیں موند کرایے بیٹھتے ہیں کہ پھر آنکھی نہیں کھولتے۔ پر خیراب تو آ جیا ہے۔“ اور یہ کہتے کہتے اس کے من میں کامنا کنمنا لی اور من سے نکل کر آنکھوں میں ہملائی۔ ایسی نظروں سے ما دھو کو دیکھا کہ اس کا جی ڈوب گیا۔  
پر ما دھونے جلدی ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ”سندھری میں تو خود اپنے کئے کی سزا کا کٹ رہا ہوں۔“  
”تو نے کیا کیا تھا؟“

”میں نے بس اتنا کیا کہ پیدا ہو گیا۔ اور اب جینے کا دکھ سہہ رہا ہوں۔“  
اس پر وہ ناری کھلکھلا کر فہری۔ بولی؟ ”مجھ سے مل۔ سکھی ہو جائے گا۔“

وہ ایک بار پھر ڈول گیا۔ مگر پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور جی کڑا کر کے کہا ”ایک چوک کر چکا ہوں۔ دوسری چوک نہیں کروں گا۔“  
”ارے مان بھی جا۔“ اس نے لجا کر کہا ”تیرے بھی دل در دور ہو جا سیں گے۔ میری بھی ناری جنم سے مکتی ہو جائے گی۔“  
ما دھو پھر پھسلنے لگا تھا۔ مگر جلد ہی اپنے آپ کو تھام لیا۔ ڈل میں کہا کر رشی جی تو پنج کر نکل گیا۔ پر میں یاں نکارتا تو پھنس جاؤں گا۔  
خیر اسی میں ہے کہ یاں سے بھاگ نکلو۔ ڈل میں یہ ٹھان کراس نے ناری کی بات کا جواب یوں دیا کہ کان پکڑے۔ کہا کہ ”نایا بَا“ اور  
چل کھڑا ہوا۔

ناری کی آنکھوں میں جو آس کی کرن جگہ کائی تھی وہ ترت کے ترت بھگئی۔ یاں بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ بولی ”تو کیسا مرد  
ہے۔ ایک ناری کو زرا شا کے اندر کار میں چھوڑ کے جا رہا ہے۔“  
ما دھو بولا ”جو خود اندر ہیرے میں بھٹک رہا ہو وہ کسی دوسرے کو اندر ہیرے سے کیا نکالے گا۔“ اور آگے بڑھ گیا۔  
ناری پیچھے سے پکاری۔ ”دیکھ پچھتا ہے گا۔“

مادھونے کا نوں میں انگلیاں دے لیں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ دور نکل کر اس نے اٹھیناں کا سانس لیا کہ کس طرح ناری جنگل میں پھنسنے سے وہ بال بال بچا ہے۔

مادھو چلتا رہا، چلتا رہا۔ دھول مٹی میں کنکروں پتھروں پر چلتے چلتے اس کے تکوے چھپل گئے۔ آخر ایک دن ایک سادھو کے درشن

ہوئے۔ مادھونے ڈنڈوت کیا اور اس کے چرنوں میں بیٹھ گیا۔ سادھو نے آنکھ بھر کر اسے دیکھا۔ پوچھا "بچہ جسے کیا دکھ ہے؟"

"سادھو مہاراج مجھ سے اک چوک ہو گئی۔"

"بچہ کیا چوک ہو گئی تجھ سے۔"

"میں پیدا ہو گیا۔"

"پھر؟"

اس کا اپائے کیا ہے؟"

"اپائے۔" سادھو نے ٹھنڈا سانس بھر کو بولا "بچہ اسی چنان میں تو میں بیاکل پھرتا ہوں۔ کتنے تیر تھے کئے کتنا بنوں میں مارا مارا پھرا کتنا گیاں دھیان کیا، پر پتہ نہ چلا کہ اس جیون روگ کا اپائے کیا ہے۔"

"مہاراج میں تو اسی یا تراپ نکلا ہوا ہوں۔ اگر آپ نہیں بتاتے تو کسی ایسے کا پتہ بتائیے جو اس کھونج میں میری مدد کرے۔"

سادھو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "سو میرا پر بست پا ایک رشی باس کرتا ہے۔ کتنی شا بدیوں سے اپنی سادھی پا آنکھیں مندے بیٹھا ہے۔ دہاں تک جانے کی ساہس ہو تو جا اور اس گیانی کے چرن چھو۔ وہی تجھے کچھ بتائے تو بتائے۔"

مادھو نے سو میرا پر بست پے جانے کا بیڑا اٹھایا اور چل پڑا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات جانا بس جائز، گرمی، برسات، کسی رت کو نہ گردانا، بس چلتا رہا۔ مرتاگرتا خوکریں کھاتا آخراں اونچے پر بست پکنچ گیا۔

دیکھا کہ ایک گپھا میں ایک بوڑھا آنکھیں مندے بیٹھا ہے بالکل چھوٹس کہ پھونک مارے سے اڑ جائے۔ جنما گیں سفید برف سماں، وہ ہاتھ جوز کر سر نیوڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔ مادھو کو غور سے دیکھا۔ "بچہ تو کون ہے۔ یاں کیا لینے آیا ہے۔"

"دکھی ہوں۔ دارو کے کھونج میں آیا ہوں۔"

"کیا دکھ ہے تجھے؟"

”جیون دیکھے۔“

”جیون تیرے لئے دکھ کس کارن بنا۔“

”اک چوک ہو گئی۔“

”کیا؟“

”سو چاتھا کہ پیدا نہیں ہوں گا۔ پر ماتا پتا کے کارن پیدا ہونا پڑ گیا۔“

”مورکھ پیدا تو ہونا پڑتا ہے۔“

”اور اس سے جود کھ پیدا ہوتا ہے۔“

”وہ سہنا پڑتا ہے۔“

”پرشی مہاراج اس کا کوئی اپائے بھی تو ہو گا۔“

”مارا مارامت پھر۔ بیٹھ جا۔“

وہ بیٹھ گیا اور بولا ”رشی مہاراج میں بیٹھ گیا۔“

”آنکھیں بند کر لے۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا ”رشی مہاراج میں نے آنکھیں بند کر لیں۔“

”کان بند کر لے۔“

اس نے کان بند کر لئے اور کہا ”رشی مہاراج میں نے کان بند کر لئے۔“

”چپ ہو جا۔“

وہ چپ ہو گیا۔ بالکل چپ۔ دن گزرتے گئے اور چپ بیٹھا۔ بالکل گم۔ جانے کتنے دن کتنے برس۔ اسے لگا کہ صد یاں بیت گئیں۔ آخر آنکھ کھولی اور بولا ”مہاراج، اب تو بہت سے بیت گیا۔“

”سے؟“ رشی نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے ماڈھو کو دیکھا ”مورکھ تو بھی تک سے کے چکر سے نہیں نکلا؟“

”تلکنے لگا تھا کہ اس نے ستاناش روئے کر دیا۔“

”کس نے؟“

”ناری نے۔“

”کون تھی وہ؟“

اس نے ساری وہ کہانی سنائی اور کہا ”جب اس نے آخری بار میری طرف دیکھا تھا تو اس کی نظروں میں کتنی نراثا تھا۔ ان نظروں کو میں

نہیں بھول پا رہا۔“

رشی نے غصے سے اسے دیکھا۔ ”مورکھ جیون بھار کیا تھوڑا تھا کہ ایک اور بوجھ تو نے اپنے دم کے ساتھ لگالیا۔ جا پہلے اس بوجھ کو اتار۔

اور پھر آ۔“

”بوجھ کو اتاروں۔ پر کیسے؟“

”اسی ناری کے پاس جا۔ ہلاک ہو کے آ۔“

وہ بہت پیٹھیا۔ ”مہاراج کے بہت بیت گیا ہے اور میں برف سے ڈھکے اس پر بت پہنچنے بیٹھے میل چکا ہوں۔“

”پر چنگاری تو تیرے اندر اب تک ملک رہی ہے۔“

وہ روپڑا۔ ”یہی تو مشکل ہے۔ یہ کیسے بجھے۔“

”وہ ہی بجھادے گی۔ جایاں سے۔ بجھ جائے تو آ جائیو۔“

کتنی بے ولی سے اٹھا۔ مگر جب چلنے لگا تو پکے ارادے کے ساتھ بولا ”بس گیا اور آیا۔“

جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے واپس چلا جا۔ چلتے چلتے اسے اچھے برے خیالوں نے آگھیرا۔ اگر یہی بات تھی تو میں نے اسے کیوں انکار کیا۔ اچھا ہوتا کہ اسی گھری سے بھگتا دیتا۔ وہ بھی سکھی ہو جاتی۔ مجھے بھی کامنا سے مکتنی مل جاتی۔ یہ کش کہ اب کھینچ رہا ہوں۔ کیوں کھینچنا پڑتا۔ ہاں بالکل۔ اچھا ہتھی ہوتا۔ اس نے کتنا سمجھایا رجھایا پر میں ہی..... اس کی ایک ایک بات ایک ایک ادا اسے یاد آئی اور بیکل کرتی چلی گئی۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ قدموں میں جیسے بیکلی بھر گئی ہو۔ چل کیا رہا تھا، دوڑ رہا تھا۔

جب اس بن میں پہنچا تو دل بلیوں اچھلنے لگا بھلا وہ کون سا بر کش تھا جس کی چھاؤں میں وہ برا جتی تھی۔ جس کی شاخیں ہری بھری اور چھاؤں گھنی دیکھی اسی پر گمان ہوا کہ یہاں تھی وہ پر وہ تو اب یاں پہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک ایک پیڑ تھے دیکھا۔ کہیں نہیں تھی۔ ہے رام وہ کہاں الوپ ہو گئی۔ کیا مجھے دیکھ کر چھپ گئی ہے۔ اری سندھی کیوں جو گئی کوتر پاتی ہے۔ کس بیکلی کے ساتھ ایک ایک کنج میں جھانا کا۔ پورا بن جھان مارا۔ کہاں گئی سندھی۔ زمین کھا گئی یا آسمان چاٹ گیا۔ اور بن جو اسے ہر ابھر ادکھائی دے رہا تھا

اجاڑ لگنے لگا، جیسے ایک دم سے پت جھر لگ گئی ہو۔

بہت دوڑ دھوپ کے بعد ایک اجڑے پت جھر کے مارے پیڑ تلے ایک جوگی دکھائی دیا کہ انگ پہ بھجوٹ ملے دھوئی رمائے بیٹھا تھا۔ چلوکوئی آدمی آدم زاد نظر تو آیا۔ سوچا کہ شاید اس سے کھوئے تینہ کا کھون ملے جا کر اس کے پیڑ چھوئے۔ جوگی نے اس کا حال دیکھ کر ترس کھایا۔ کہا کہ ”بچہ تو بہت چلا ہے۔ بیٹھ جا۔“  
وہ بیٹھ گیا۔

”اس اجاڑ بن میں کس کارن مارا ما را پھرتا ہے۔“

”جوگی جی یاں یا ایک ناری تھی۔ تینیں کہیں ایک پیڑ تلے برا جی ہوئی تھی۔ اب آیا ہوں تو وہ مل نہیں رہی۔ کچھ اس کا پتہ ہو تو بتاؤ۔“  
”وہ ناری کون تھی اور تو کون ہے۔“

جواب میں اس نے اپنی ساری رام کہانی سناؤالی۔ جوگی نے ساری کہانی سنی۔ پھر افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا ”جس یا تری کے راستے میں ناری آنکھ اور آنکھ کل جائے پھر اسے بہت ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اور بہت پچھتا ناپڑتا ہے۔“

”جوگی جی، پھر میں کیا کروں۔“

”اے ڈھونڈو۔“

”بہت ڈھونڈا۔“

”اور ڈھونڈھ۔“

”کتنا تو ڈھونڈ لیا۔ کب تک ڈھونڈوں۔“

”مور کھ ڈھونڈ نے والے نہیں پوچھا کرتے بس ڈھونڈتے رہتے ہیں۔“

ما دھویے سن کر ترنات انٹھ کھڑا ہوا اور آگے چل پڑا۔ ایک ایک پیڑ تلے جھانکتا اور آگے بڑھ جاتا اسی میں کتنی دور نکل گیا سو میرہ پرہبت اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ چلنے چلتے پاؤں چھل گئے سو جھ گئے پر وہ چلتا چلا گیا۔ تب کبھی یوں لگتا کہ۔ وہ صد یوں سے چل رہا ہے، بھکلتا پھر رہا ہے تھوڑا بھکلتا اور سوچتا کہ اس یا ترا کا کوئی انت بھی ہے یا نہیں اور پھر چل پڑتا۔ مگر ان کہاں رستہ تو الجھتا لمبا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور رستہ جتنا الجھتا لمبا ہوتا گیا اتنا ہی اس کا پچھتا دا بڑھتا چلا گیا۔



## نرالا جانور

زمانوں اور زمینوں میں گھوٹتے پھرتے دیاس جی کو ایک لہر آئی کہ ہمارا پور کی طرف ہولئے اور راجہ جنمی جنے کے دربار میں جابرائے جنمی جنے اس درشن پر خوشی سے پھولانہ سایا۔ سلگھاں سے اتر کر اس مہان آتما کو سلگھاں پر بھایا اور چاندی کے لگن میں گلاب کیڑے کے ملکتے پانی سے ان کے پیدھوئے۔ دیاس جی نے اس کے سرپر ہاتھ پھیرا اور اشیر واد دی۔

جمنی جنے کے دماغ میں کب سے ایک پھانس کھنک رہی تھی۔ اس کے پرکھوں کو کیا ہو گیا تھا کہ لڑکے کٹ مرے کو نسلیں ختم ہو گئیں۔ کیوں ان بدھیمانوں کی بدھی میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ جنگ میں کوئی جیتے کوئی ہارے پر تباہی سب پر آتی ہے۔ پر کون تھا جس سے وہ یہ پوچھتا۔ سنی سنائی سے اس کی تسلیم نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو کسی ایسے سے پوچھنا چاہتا تھا۔ جس نے وہ سب کچھ دیکھا پر ایسا اب کون تھا، جنمی جنے مہا بھارت کے بعد کی دوسری پیڑھی میں سے تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو مہا بھارت کے بڑے بوڑھے کہانی بن چکے تھے۔ اس زمانے کی کہانیاں ان گنت تھیں، پر آدمی اب کوئی باقی نہیں تھا۔ اب جو دیاس جی نے درشن دیئے تو اس کی آنکھوں میں روشنی آئی اور ساتھ ہی دماغ میں اڑی پھانس اور زیادہ کھلنے لگی۔ اسے لگا کہ اب اسے اپنے سوال کا جواب مل جائے گا کہ اس کے بڑوں کا بڑا اس کے سامنے آن موجود ہوا تھا، وہ جس کے تینیں مہا بھارت کے سب بڑے بچے تھے۔

جمنی جنے دیاس جی کے چرنوں میں بیٹھ گیا۔ ادب سے بولا ”رُشی مہاراج میں تو زمانے بعد پیدا ہوا تھا۔ آپ نے تو سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا اور پھر وہ سب آپ ہی کی سمنان تھے۔ کچھ مجھے بتاؤ کہ انہیں کیا ہو گیا تھا کہ کروکشیتھر میں نو نیزے پانی چڑھا۔“ دیاس جی نے بیان کرنا شروع کیا کہ کروکشیتھر میں کیسارن پڑا کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

جمنی جنے ہاتھ جوڑ کر بولا ”امیرے بڑوں کے بڑے میں نے ساری کتخاں پر میری یتیکلی باقی ہے۔“  
”کیا بے کلی ہے تجھے۔“

”مہاراج“ مجھے یہ سوال بے کل کر رہا ہے کہ میرے بڑوں کو ہو کیا گیا تھا۔ کیا انہیں پتہ نہیں تھا کہ جنگ میں بر بادی ہی بر بادی ہے پھر کو روں پر کیا جن سوار ہوا اور پانڈوؤں کے دماغ میں کیا سماںی کہ آپس میں کٹ مرے۔“ دیاس جی نے تھنڈا سانس بھرا ”آدمی مورکھ ہے۔“

”پرمہاراج وہاں تو بڑے بڑے گئی گیانی موجود تھے پانڈوؤں میں بھی اور کوروؤں میں بھی۔

”اویسیہ تھے۔ پرمیرے بیٹے جب بری گھری آتی ہے تو بدھی والوں کی بدھی بھرث ہو جاتی ہے۔“

”مہاراج بدھی والوں کی بدھی کیسے بھرث ہو جاتی ہے۔“

”بس آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور مت ماری جاتی ہے اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جیسے تیری آنکھوں پر پردے پڑ جائیں گے اور مت ماری جائے گی اور ہونی ہو کر رہے گی۔“

جنہی جنہی چونک پڑا۔ اے گئی گیانی، میری آنکھوں پر کیسے پردے پڑ جائیں گے اور کیسے مت ماری جائے گی۔“

”میرے بیٹے نہ پوچھنے کا کوئی فائدہ ہے نہ بتانے کا کوئی فائدہ ہے۔ آدمی مورکھ ہے۔ جو ہونی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔“

”رشی مہاراج، اگر تم مجھے بتا دو گے تو میں چوکنا ہو جاؤں گا۔ پھر ہونی کیسے ہو گی۔“

”لے میں بتائے دیتا ہوں۔ گھوڑوں کا ایک بیو پاری ایک گھوڑا نپٹ سندر لے کر تیرے دربار میں آئے گا تو اس گھوڑے پر اہلوٹ ہو جائے گا۔ بیو پاری کو منہ مانگے دام دے کر گھوڑے کو لے لے گا۔ بس پھر جو ہوتا ہے وہ ہو گا۔“

”اچھا ایسا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ مہاراج آپ کا ویش میرے لئے کیا ہے۔“

”بیٹے میں تو بھی کہتا ہوں کہ اس گھوڑے کو خرید یوہی مت مفت بھی ملے تو مت یجیو۔ مگر تو کہاں مانے گا۔“

جنہی جنہی نے کہا ”رشی مہاراج، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو اسے نہیں خریدوں گا، رک کر بولا۔“ پر ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھ۔ پچ۔“

”ویسے تو میں وہ گھوڑا خریدوں گا نہیں۔ لیکن اگر میں خرید لوں تو پھر کیا ہو گا۔“

”پھر تیرا اس پر سوا ہونے کو تجھی چاہے گا۔ دیکھ میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ اس پر سوار مت ہونا۔“

”رشی مہاراج، اگر آپ کی آگیا نہیں ہے تو میں اس پر سوار نہیں ہوں گا۔“ رک کر بولا ”پرمیرے دل میں ایک کرید ہے۔“

”وہ کیا ہے۔“

”ویسے تو میں آپ کی آگیا کا پالن کروں گا اس گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گا۔ لیکن اگر میں اس گھوڑے پر سوار ہو گیا تو پھر کیا ہو گا۔“

”مورکھ ہوگا، ہوگا یہ کہ وہ گھوڑا بگٹ دوڑ پڑے گا۔ پلک مارتے ہوا ہو جائے گا۔ تیرے رو کے نر کے گا۔ ایک جنگل بیباں میں لے جا کر تجھے چھوڑ دے گا۔“

”مہاراج، جنگل بیباں میرا کیا بگاڑے گا۔ میں نپٹ ڈراونے بنوں میں گھوما پھرا ہوں۔“

کبھی بھوتوں پر یتوں را کشوں سے پالا پڑا، کبھی اجگروں سے، کبھی شیروں، چیتوں سے پر جو بھی میرے سامنے آیا تھا کے نہیں گیا۔

ویاں جی فتنے ”میرے بھولے پڑا ان سب بلاؤں سے بڑھ کر ایک بلا ہے۔“

”وہ کون بلا ہے؟“

”ناری۔“

”ناری؟“

”ہاں ناری۔ وہ بڑی بلا ہے۔ اس کا کانا پانی نہیں مانگتا۔ میرا کہا مانے گا تو نجح جائے گا۔ نہیں تو مارا جائے گا۔ پر رونا ہی ہے کہ تو میرا کہا مانے گا نہیں اور ہونی ہو کر رہے گی۔“

”مہاراج آپ کا کہا کیوں نہیں مانوں گا۔“

”اڑے جب سینگلی رکھ جیسے بیٹے نے وجدنک جیسے باپ کا کہا نہ مانا اور ہونی ہو کر رہی تو میرا کہا کیا مانے گا۔“

”مہاراج، وجدنک کا کہا کیا تھا کہ سینگلی رکھنے نہیں مانا تھا اور کیا ہونی تھی کہ ہو کر رہی؟“

تب ویاں جی نے جنمی جے کو سینگلی رکھ اور وجدنک کی کھانا سنائی۔ وجدنک رشی کا خیال تھا کہ آدمی کی صحبت آدمی کو خراب کرتی ہے۔ سوانحوں نے ایک زجن بن میں باس کیا اور وہیں بیٹے کو پالا پوسا۔ بیٹا سینگلی رکھ بھی باپ کی طرح بڑا ہمسوی تھا۔ آدمیوں کی دنیا سے دور نرناری کی صورت سے بیگانہ اپنی تھپ میں مگن رہتا تھا۔ پر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ انگ دلیں میں سوکھا پڑ گئی۔ کھڑی کھیتیاں جل گئیں۔ انماج کے نام دانہ نہیں اگا۔ راجہ نے برہمنوں کو جمع کیا اور پوچھا کہ مینھ کے نام بوند نہیں پڑی کچھ بتاؤ کہ کیا کیا جائے۔ برہمنوں نے سوچ بچا کر کے کہا کہ ندی پار بن میں سینگلی رکھ باس کرتا ہے۔ باپ نے اسے بستی میں آنے سے منع کر رکھا ہے۔ اگر کسی طور بہلا پھسلا کر اسے بستی میں کوئی لے آئے تو بکھا ہوگی اور سارے دلدر دوڑ ہو جائیں گے۔

راجہ نے سوچ بچا کر کے ایک چاٹر کچنی کو بلا یا اور آدمیش دیا کہ سینگلی رکھ کو بہلا وادے کے کسی طرح انگ دلیں میں لے آ۔ اس

کنچنی نے اپنی ناؤ بناوائی۔ اس میں بیٹھ کر ندی کے پار گئی اور ایسے سینگل رکھ کے پاس پہنچی جب وہ بندر کہیں دور جنگل میں ایندھن آکھا کرنے لگیا ہوا تھا۔ سینگل رکھا سے دیکھ کر بھوچک رہ گیا۔ ناری کو اس نے کب دیکھا تھا اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ ناری کیسی ہوتی ہے۔ پوچھا ”تم کون ہو۔ تمہارا آشرم ہے۔ یہاں کیسے آتا ہوا۔“ وہ بولی ”تمہاری داہی ہوں۔ میرا آشرم ندی کے اس طرف ہے۔ تمہارے لئے پھول مالا اور پھل لے کر آتی ہوں۔“ کہہ کے اس نے اس کے گلے میں پھول مالا ڈالی۔ میٹھے میٹھے پھل جو لے کر آتی تھی کھلانے۔ پھر چلنے کے لئے تیار ہوئی۔ چلتے ہوئے بولی کہ ”اب میں چلتی ہوں۔ پر دیسیوں کی جوریت ہے اسے پوری کرنے کی آگیادو۔“ سینگل رکھنے کہا کہ ”آگیادی۔“ کنچنی نے آگے بڑھ کر سینگل رکھ کے گلے میں بانیس ڈالیں سینے سے سینہ ملایا اور ہونوں پر ہونٹ رکھ دیئے سینگل رکھ کچھ نہ سمجھا کہ یہ کیا ہوا۔ پر اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ کنچنی چلی گئی اور وہ اسی طرح بے سدھ کھڑا رہا۔ وہ بندر ک رشی واپس آیا تو بیٹھے کے طور دیکھ کر چکرا یا۔ کہا ”پتر میں دیکھتا ہوں کہ تیرا طور بے طور ہے۔ گلے میں پھول مالا پڑی ہے۔ یہ پھول مالا کہاں سے آئی۔ اور پھلوں کے چلکے یہاں کیسے پڑے ہیں۔“

سینگل رکھنے جھر جھری لی۔ کہا کہ ”باپ، ایک جانا آیا تھا۔ ایسا سند رکہ میں تو دیکھ کر موہت ہو گیا۔“

”کون تھا وہ جتنا۔“

”کوئی دیا رکھی تھا۔“

”کیسا تھا وہ دیا رکھی۔“

”کیا بتاؤں کیسا تھا۔ بال گھٹا سے گال گلابی نہیں متوا لے ہونٹ رسیلے سینہ جیسے دو پھول پھولے ہوں۔ ہر پھول پر ایک بھوزر بیٹھا ہو۔ پہیٹ چندن کی تختی، کمر پتلی، کولبے بھاری بس باپ اس سے آگے کی مت پوچھو۔“ وہ بندر نے ماتھا پیٹا ”مور کھ تو اسے دیا رکھی کہتا ہے۔ وہ تو ناری تھی۔“

”ناری؟“ سینگل رکھ چکرا یا ”ناری ایسی کیسی ہوتی ہے۔“

”ہاں میرے نادان بیٹھے وہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ یاں پر کیسے آئی۔“

”رام جانے کیسے آئی۔ بس آگئی۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔ اچھا بتا اس نے تیرے پاس آ کر کیا کیا۔“

”وہ مجھے دیکھ کر مسکائی۔ میرے گلے میں پھول مالا ڈالی۔ مجھے پھل کھلانے۔ پھر میرے گلے میں بانیس ڈالیں۔ سینے سے سینہ

ملا یا اور ہوتو پہ ہوت رکھے۔"

"اور کیا؟" وہ صدر نے سخت پریشان ہو کر پوچھا۔

"بلس۔"

وہ صدر نے ایک شک کے ساتھ بیٹے کو سر سے پھر تک دیکھا "اور کچھ نہیں ہوا؟" "نہیں۔"

وہ صدر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "ویسے تو بہت برا ہوا۔ پھر ہوئی کہ تو جوگ بلاس سے بچ گیا۔" "بھوگ بلاس؟ باپ وہ کیا چیز ہوتی ہے۔"

"بیٹے اسے نہ جانے ہی میں تیرا بھلا ہے۔" پھر سوچ کر کہا "دیکھا ب وہ آجائے تو اس سے بات نہ کھیو۔"

"بیٹے نے باپ کے آدیش کو گرد میں باندھ لیا۔ سوجب اگلے دن وہ آئی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ تو توناری ہے۔ میں تجھ سے بات نہیں کروں گا۔ تو وہ اپنے چلی جا۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ میرے بھگوان کی اچھا یہ ہے کہ میں چلی جاؤں تو لے میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایسے انھلاکر چلی کر سینگلی رکھ تملأ گیا۔ اس نے پکارا "اوناری ذرا رک۔" وہ رک گئی۔

"ایک بات بتاتی جا۔"

"کیا۔"

"بھوگ بلاس کیا ہوتا ہے۔"

پچھی نے مسکرا کے اسے دیکھا اور بولی "یاں پہنیں بتاؤں گی۔" "پھر کہاں بتائے گی۔"

"میرے ساتھ چلندی کے پار جا کے بتاؤں گی۔"

سینگلی رکھ کو تو چینک لگی ہوئی تھی کہ یہ بھوگ بلاس کیا چیز ہوتی ہے۔ اسی چینک میں وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اسے ناؤ میں بٹھا کر ندی کے اس پار لے گئی اور جب ندی کے پار اتر کر اس نے انگ دلیں میں قدم رکھا تو چھم چھم مینہ بر سے لگا۔ راجہ بہت خوش ہوا۔ اس

نے آدمیوں کو دوڑایا کہ سینگلی رکھ کے گلے میں پھول مالاڑا اور آدر کے ساتھ میرے پاس لاؤ۔ میں راجملاری کے ساتھ اس کا بیاہ کروں گا اور دوبار میں اوپنے استھان پر بٹھاؤں گا۔

راجے کے آدمی دوڑے ہوئے گئے۔ سینگلی رکھ کے گلے میں پھول مالاڑا اور ہاتھی پر بٹھا کر اسے راج دربار کی طرف لے کے چلے۔ سینگلی رکھ نے کچنی کی طرف دیکھا اور کہا کہ ”میں جس بات کے لئے آیا تھا وہ تو رہ ہی گئی۔ تو نے مجھے بھوگ بلاس کا مطلب نہیں بتایا۔ یاں پر آئے تو چکر دوسرا ہی چل گیا۔“

کچنی نے تھقہ لگایا اور کہا ”اب بھوگ بلاس کا مطلب تجھے راجملاری سمجھائے گی۔“

راجملاری نے تو اسے وہ بھاؤ بتابے کہ پھر نہ اسے اپنی تپ یاد رہی نہ باپ کا خیال آیا۔ راجملاری کا ہورہا اور رنگ رس میں ڈوب گیا۔

یہ کہانی سن کر ویاس جی یوں بولے۔ ”ناری اس طرح آدمی کو اس کے رستے سے بھکاتی ہے۔ دیکھ جنمی جنے تجھے بھی اس بن میں ایک ناری ملے گی۔ میرے کہے کو پلے باندھ لے۔ اس ناری سے بات مت کیجوں مگر تو کہاں مانے گا۔ اس سے بات کرے گا اور ہونی ہو کر رہے گی۔“

جنمی جنے نے کہا ”رشی مہاراج، آپ کی بات میں نے پلے باندھ لی۔ اس ناری کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا، بات کرنا تو بعد کی بات ہے۔ پر ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھے“

”اگر میں نے اس سے بات کر لی تو کون سی ہونی ہے جو ہو کر رہے گی۔“

”مورکھ ناری انگلی پکڑتے پہنچا پکڑتی ہے۔ تو اس سے بات کرے گا اور تو اسی پر بس نہیں کرے گا۔ پھر اسے اپنے راج محل میں لے جانے کی سوچے گا۔ جنمی جنے اسے راج محل میں یجا کے مت رکھیو۔ پر تو کہاں مانے گا۔ ہونی تو ہو کر رہے گی۔“

”رشی مہاراج، آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ اس ناری کو راج محل لے جا کے نہیں رکھوں گا۔ پر مجھے آپ کے اس کہنے نے کہ ہونی ہو کر رہے گی چنان میں ڈال دیا ہے۔ تو میں یہ پوچھوں ہوں کہ اگر میں اس ناری کو راج محل میں لے گیا تو کیا ہو جائے گا۔“

”پوچھتا ہے کیا ہو جائے گا۔ ارے غضب ہو جائے گا۔ تیرے ہاتھوں سے اتنی بڑی ہنسا ہو گی کہ لوگ کو روکشیر کی ہنسا کو بھول جائیں گے۔“ ویاس جی یہ کہتے کہتے الپ ہو گئے۔

جنی جئے حیران ہوا کہ ویاس جی کہاں گے۔ آدمیوں کو دور دور تک دوڑایا۔ پرویاس جی کا اتا پتہ نہ چلا۔

جنی جئے نے اپنے آپ کو بہت بھاگوان جانا کہ ویاس جی نے اسے درشن دیئے۔ اس درشن کو اس نے بہت دنوں تک یاد رکھا۔ مگر پھر راج کا ج کے چکروں میں بات آئی گئی ہو گئی اور ویاس جی نے جو باتیں کہی تھیں وہ تو بالکل ہی بسر گئیں۔

ایک دن گھوڑوں کا ایک بیو پاری راج دربار میں آیا۔ اس کے پاس ایک ہی گھوڑا تھا پر کیا شامدار تھا۔ اوچا قد، سفید رنگ، چمکتی جلد جیسے دھوپ کا نکڑا ہو۔ ایال مانو پری کے بال بدن چست جیسے جلد کی تہہ میں پارا ہو۔ جنی جئے اس پر ایسا رسجھا کہ منہ مانگے دام ادا کے اور ترنٹ ہی اس پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا پہلے ہی بے تاب ہو رہا تھا۔

رانوں کے پیچے آیا تو تڑپ کر اس طرح دوڑا کر دم کے دم میں کہیں سے کہیں پہنچا۔ بستی کی راہوں کو رومندتا جنگل میں جائکلا۔ گھنے بنوں میں اجنبی ان دیکھے راستوں پر دوڑا چلا جا رہا تھا۔ جنی جئے نے بہت باگ چینچی پر گھوڑا رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ دیر بعد خود ہی ایک جنگل بیان میں پہنچ کر ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں تک ٹھیک گیا۔ جنی جئے کا سانس میں سانس آیا۔ فوراً ہی اتر پڑا۔ مگر کیا دیکھتا ہے کہ اس چھاؤں میں ایک سندر ناری سول سنگھار کئے بیٹھی ہے۔ راجہ بھوچک رہ گیا۔ اسی دم اسے ویاس جی کی بات یاد آئی۔ دل ہی دل میں اپنے آپ پر لعنت کی کہ مور کھورو کی آسکیا کو بھولا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر دل میں فیصلہ کیا کہ اب تک جو ہوا سو ہوا پر اب میں ویاس جی کے آدمیش کا پورا پورا پالن کروں گا۔ سو جب اس ناری نے اسے مسکرا کر دیکھا تو اس نے اپنے مچلتے دل کو سنجھا لا اور جی کڑا کر کے کہا کہ اے سندر ناری! میں اپنے گورو کے حکم سے مجبور ہوں۔ سو میں نہ تجھے سے نہوں یو لوں گا نہ یہ پوچھوں گا کہ اس زمین بن کس کارن بر اجنا ہوا۔“

سندر ناری نے یہ سن اسے تیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا ”میں بھی تو سنوں کہ وہ کون گورو ہے جس نے تجھے مجھ سے بات کرنے میخ کیا ہے۔“

”وہ ہمارے مہان گورو ویاس رشی ہیں۔“

اس پر اس نے زہر بھرا تھا لگایا۔

”اے سندر ناری کیا تو ویاس رشی کو نہیں جانتی جو اس طرح بُنی ہے۔“

”جانتی ہوں۔ خوب جانتی ہوں۔“

”پھر کیا تجھے اس مہان آتما کے گیان میں شک ہے۔“

”رشی مہاراج کے گیان میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ پر اس گیانی کوناری گیان کتنا ہے۔“

”یہ تو کہہ رہی ہے۔“

”صحیح کہہ رہی ہوں۔ گیانی ہونا اور بات ہے۔ ناری کو جانتا اور بات ہے۔ اس رشی کوناری کا ہے سیتاوتی نے اسے ایک رات کے لئے اپنی دورانہ بہوؤں سے بھڑاد یا تھا۔ سو جو کچھ ہوا وہ سب کو پتہ ہے۔ ایک نے اس بوڑھے کھوٹ کی لبی الجھی جٹا میں دیکھ کر ڈر سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری اسے دیکھ کر پہلی پھدق پڑ گئی۔ سو ایک نے انداھا پینٹا جنا۔ دوسری کے پیٹ سے پیلا ہلدی بالک پیدا ہوا۔“

یہن کرجنمی جنے سوچ میں پڑ گیا۔ ول میں کہا کہ ناری کہتی تو جمیک ہے ویساں جی ویسے تو جگت گیانی ہیں۔ ویدوں پر انوں میں پیرے ہوئے۔ پران کا ناری کا خانہ تو خالی ہے سندر ناری نے بجانپ لیا کہ تیرنٹا نے پر لگا۔ اب وہ ڈانواؤں ہے۔ چند راکر بولی کہ سورکھ مجھے تیرا کیا میٹھا ہے۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ چلواس سونے بن میں ایک سے دو ہوئے۔ کوئی بھلامانس ہے۔ دو باتیں ہوں گی تو دل بیٹھے گا۔ پر تو توبان مانس نکلا آتے ہی مانس گند الائپنا شروع کر دیا۔ تو لے میں چلی۔ ”اور تاؤ کھا کر انہوں کھڑی ہوئی۔ اس سندر ناری کی یہ ادا دیکھ کر جنمی جنے تڑپ انھا۔ چلنے لگی تھی کہ اس نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اے سندری اتنی کھور مت بن تو جائے گی تو ساتھ میں ایک جان بھی جائے گی۔ کیوں ایک جیو کی تیا کا پاپ اپنے سر لیتی ہے۔“

”چھوڑ میری کلائی۔ میں ایسی اڑن گھائیوں میں آنے والی نہیں ہوں۔“

غصے سے وہ لال بھجوکا ہو رہی تھی۔ تیوری پہ کتنے بل آئے کتنے بل گئے مگر جنمی جنے کی پکڑ کے پیچ وہ مووم ہوتی چلی گئی۔ آخر کو بالکل ہی چکھل گئی۔ ایسے چکھل جیسے گرم الگیوں میں گھمی چکھلتا ہے۔ اوہ جنمی جنے بھی چکھلتا چلا گیا۔ ایسے ملے کہ جیسے ایک دوسرے میں گھل جائیں گے

بھر پور ملے۔ مگر چاہت میں ذرا جو کی آئی ہوئی گلی اور بڑھ گئی۔ جنمی جنے نے آؤ دیکھانہ تاؤ اسے کوئی بھی میں بھر کر انھا گھوڑے پر بٹھایا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا دم کے دم میں ہوا سے با تین کرنے لگا۔ جس طرح فرائے بھرتا آیا تھا اسی طرح فرائے بھرا وہ اپس چلا۔ پھر وہ راج محل کے پھانک پر جا کر ہی رکا۔

سندر ناری جنگل سے نکلی، راج محل میں برا جئی ہستا پور میں راج رجنے لگی۔ جنمی جنے اس کے پاؤں دھو دھو پیٹھا تھا۔ اور اس کا ٹھسا ایسا کہ ناک پر کھمی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ ایسا ہوا کہ جنے نے پنڈتوں و دھوانوں کی سجا بلائی۔ اس میں یہی نویلی رانی بھی براجی۔

پنڈتوں و دھوانوں نے اسے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایسا سدر مکھڑا ایسی چوب انہوں نے کب دیکھی تھی۔ بس سدری کی تیوری چڑھ گئی۔ ترنٹ انھ کھڑی ہوئی اور کراور چوٹی کا عالم دکھاتی اندر لوٹ گئی۔ یہ دیکھ جنمی جنے کا ماتھا ٹھنکا پیچھے چیچھے اندر گیا۔ سمجھا کے پیچ میں سے اچانک انھ آنے کا ران پوچھا تو لال پیلی ہو کر بولی کہ پنڈتوں نے مجھے بری نظروں سے دیکھا ہے۔ راجہ نے یہ سنا تو آگ بگولا ہو گیا۔ ان پنڈتوں کی یہ مجال کہ میری رانی کو بری نظروں سے دیکھیں۔ ادھر سدری نے کہہ دیا کہ راج نگر میں اب یہ پنڈت رہیں گے یا میں رہوں گی۔ اس اعلان نے جلتی پتیل کا کام کیا۔ راجہ کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ فوراً اپٹانا اور سنگھاسن پر بیٹھ کے ان سب پنڈتوں کی گرد نیں اتارنے کا حکم دے ڈالا۔

جب پنڈتوں کی گرد نیں اتر گئیں تو اس کا کلیچ بھٹٹا ہوا۔ سوچا کہ اندر راج محل میں جا کر اپنی رانی کو بتاؤں کہ تمہارا اپمان کرنے والوں کی گرد نیں اتر گئیں کہ اس کا کلیچ بھی بھٹٹا ہو جائے۔ یہ سوچ کر سنگھاسن سے انھنے لگا تھا کہ اچانک جانے کہاں سے دیاں جی آن وار وہوئے۔

جنمی جنے نے انھ کرو یا س جی کا سو اگت کیا۔ انہیں سنگھاسن پر بٹھایا۔ چاندی کا گلن اور گلاب کیوڑے کا پانی منگا کر ان کے چیر دھونے لگا تھا کہ دیاں جی نے ٹوکا۔

”پڑ“ تیرے ہاتھ گندے ہیں۔“

یہ سن کر جنمی جنے پٹایا۔ بولا ”اچھا میں ہاتھ دھو کر پاک کئے لیتا ہوں۔“

دیاں جی نے اسے دیکھا، اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ پھر غصے سے بولے ”مور کہ تیرے ہاتھ تو خون میں نہ ہوئے ہیں۔ اب تو گناہ جننا کا سارا پانی بھی ان پر انڈیل دیا جائے تو وہ پورا نہیں ہوں گے۔“

جنمی جنے سانے میں آگیا۔

پھر دیاں جی آپ ہی آپ اداس ہو گئے۔ ڈھنی ہوئی آواز میں بولے ”آدمی نرالا جانور ہے۔ بدھی رکھتا ہے۔ بدھی کو کام میں نہیں لاتا۔ سمجھاؤ تو سمجھتا نہیں۔ منع کر تو مانتا نہیں۔ سو ہونی ہو کر رہتی ہے۔“

پھر بچھے دل کے ساتھا ٹھنکے اور بنوں کی طرف نکل گئے۔



# تعلق

صحیح اور اخبار والے نے اخبار پھینکا اور خواجہ صاحب نے دروازہ کھلکھلایا۔

”کرامت میاں اخبار آگیا.....؟“

”جی آگیا ہے۔ آئیے تشریف رکھیے“

یہ میرے ناشتے کرنے اور دفتر جانے کا وقت ہوتا تھا۔

ہمارا ڈرائیگ اور ڈرائیگ کمائنڈ ہے اور میں بیگم کے ساتھ مل کر ناشتہ کر رہا ہوں اور ڈرائیگ روم میں خواجہ صاحب اخبار پڑھنے میں غرق ہیں۔

”خواجہ صاحب آئیے ناشتہ کیجیے۔“

”بیٹھ بسم اللہ کرو۔“

”ناشتنیں کرتے تو چائے ہی پی لیجیے۔“

”نبیں بیٹھ میں تو بس اخبار پر ایک نظر ڈالنے کے لئے آیا ہوں۔“

”وہ بھیک ہے مگر ساتھ میں چائے بھی ہو جائے تو کیا مضا لئے ہے۔ کوئی غیریت تو نہیں ہے۔“

”بیٹھ میں اس گھر میں خدا غریق رحمت کرے سید صاحب کے وقت سے آرہا ہوں اب تم ان کی نشانی ہو بھلام میں سے غیریت برتوں گا.....“

بجا کہا۔ اصل میں تو والد صاحب سے ان کی دوستی تھی جائزے گرمی برسات روز صحیح کو دروازہ کھلکھلانا ان کے پاس بینہ کر اخبار پڑھنا باتیں کرنا اور چلا جانا۔

مگر انتقال کے بعد بھی انہوں نے وضع داری قائم رکھی۔ اسی طرح صحیح کو آ کر اخبار پڑھنا اور چلے جانا باقی کسی بات سے مطلب نہیں۔ کبھی اکا دکا بات بھی کی تو اخبار ہی کے حوالے سے۔

”کرامت میاں، اخباروں کو کیا ہو گیا ہے۔“

”کیا ہوا خواجہ صاحب؟“

”آج تو کوئی خبر ہی نہیں ہے۔“

”خواجہ صاحب، خبر کوئی آئے گی تب اخبار میں شائع ہوگی آج کوئی بڑی خبر ان کے پاس نہیں ہوگی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو کرامت میاں۔ اتنی بڑی دنیا اتنی بہت سی خلقت اور دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا جو کبھی نہ ہوا تھا وہ اب ہو رہا ہے اور ہمارے اخباروں کے پاس دینے کے لئے خبر نہیں ہے۔  
یہ کہتے کہتے انھوں کھڑے ہوئے۔

”جار ہے ہیں آپ.....؟“

”ہاں بھی چل کر گھر کو دیکھتے ہیں آج تو میں مسجد سے نکل کر سیدھا اسی طرف آگیا سوچا کہ گھر بعد میں پہلے کرامت میاں کے بیباں چل کر اخبار پر ایک نظر ڈال لیں۔ مگر اخبار میں کوئی خبر ہی نہیں تھی۔“

ان کے جانے کے بعد بیگم نے کتنا مبارکہ میانا کا سانس لیا۔ ”شکر ہے خدا کا آج تو ایسے جم کے بیٹھے تھے کہ ملنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اور اخبار میں بقول ان کے آج کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ خبر نہ ہونے پر تو اتنا جم کے بیٹھے خبر ہوتی تو بس یہیں ڈیرا ڈال لیتے۔“

”بیگم کیوں خون جلا رہی ہو اپنا ناشتہ کرو۔“

”خون تو جلتا ہی ہے یہ تمہارے خواجہ صاحب مجھے زہر لگتے ہیں روز صح آن دھکتے ہیں کہتی ہوں کہ اخبار پڑھنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اخبار خریدیں ہمارے سینے پر کیوں موغل دلتے ہیں۔“

”اصل میں خواجہ صاحب اب اجان کے وقت کی وضعداری کو نبادر ہے ہیں۔“

”یا اچھی وضع داری ہے اس بہانے وہ اخبار کا خرچ بچائیتے ہیں۔“

مگر آخر سال میں گئے چندے ایسے دن بھی تو آتے ہیں جب اخبار چھٹی کرتے ہیں وہ 26 دسمبر کی صح تھی ناشر کرتے کرتے مجھے خواجہ صاحب یاد آگئے۔

”آج خواجہ صاحب نہیں آئے۔“

”آج اخبار جو نہیں آیا ہے۔“

”ہاں آج تو اخبار کی چھٹی ہے۔“

”اچھا ہی ہے میں تو کہتی ہوں روزہ ہی اخبار کی چھٹی ہوا کرے۔“

”بیگم تمہارا بس چلے تو پورے پریس کی چھٹی کرا دو خواجہ صاحب کی ضد میں صحافت کی تو دشمن مت بن جاؤ۔“

”صحافت“ بیگم نے کتنے تحقیر بھرے لجھ میں کہا۔ ”یہ کبخت نیاشہ نکلا ہے اب یہ تمہارے خواجہ صاحب ہیں انہیں افیون کی لت نہ پڑی اخبار کی لت پڑ گئی بات تو ایک ہی ہے۔“

”نشہ کیا بس ایک عادت ہوتی ہے صحیح اور اخبار لازم و ملزم بن کر رہ گئے ہیں جس صحیح اخبار نہ آئے وہ صحیح خالی ہی لگتی ہے۔

شریف آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔“

”آخر پچھلے زمانے میں بھی تو صحیح ہوا کرتی تھی۔“

”پچھلے زمانے کا اپنا طور تھا۔ صحیح کو باغون میں جا کر سیر کرتے تھے۔ اکھاڑوں میں زور کرتے تھے اسکے بعد ڈٹ کر ناشت۔ طلوہ پوری نہاری سری پائے لسی کا گلاس وہ سب اب کہاں۔ اب تو دوسرق کا اخبار اور چائے کے ساتھ دو توں اب صحبوں میں یہی پچھرہ کیا ہے۔“

میں ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بھی ”اللہ دین دیکھ کون ہے دروازے پر۔“

اللہ دین دیکھنے سے تیزی سے نکل کر دروازے پر گیا تیزی سے واپس آیا ”خواجہ صاحب ہیں جی۔“

”پھر آگئے بیگم کا مودہ پھر خراب ہو گیا۔“ یہ ہمارا پچھا نہیں چھوڑیں گے۔

”بالاوندر۔“

”کیوں بالا لو۔ آج کون سا اخبار ان کی جان کے لئے رورہا ہے۔“

”بیگم مردت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اب اگر خواجہ صاحب آ جاتے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ آپ چلے جائیے۔“

”تمہاری جگہ میں ہوتی تو صاف صاف کہہ دیتی ذرا لگلی لپٹی شر کھتی۔“

اتنے میں خواجہ صاحب آن داخل ہوئے۔ بیگم کو اپنا بیان بیچ میں روکنا پڑا۔

”آئیے خواجہ صاحب تشریف رکھیے مگر اخبار تو آج آیا نہیں ہے۔“

”ہاں بھی کل چھٹی تھی آج تو اخبار آنا ہی نہیں تھا مگر مجھے خیال آیا کہ بھی چل کے کل ہی کا اخبار دیکھ لیں۔“

”کل آپ نے اخبار نہیں دیکھا تھا۔“

”دیکھا تھا میٹا۔ مگر کیا پوچھتے ہو ہمارا حافظہ جواب دے گیا ہے کھنڈ بھر پہلے کی کہی بات یاد نہیں رہتی ایک دن پہلے پڑھا اخبار کہاں یاد رہتا ہے۔“

”الل دین کل کا اخبار لاو۔“

میری آواز پر الل دین کچن سے نکل آیا کل کے اخبار کے مطالبے پر پڑھایا۔ ”کل کا اخبار.....؟“  
”ہاں کل کا اخبار۔ کیوں کیا بات ہے؟“

اس موقع پر بیگم الل دین کے آڑے آئیں۔ ”کل کا اخبار تو استعمال میں آگیا ہے۔ میں نے ہی الل دین سے کہہ دیا تھا کہ الماری کے خانوں میں بچھانے کے لئے اور کاغذ کہاں سے لاوں۔ آج کا اخبار پڑا ہے اب اس کی کیا ضرورت پیش آئے گی اسے ہی بچھالو۔“

خبر کوئی بات نہیں خواجہ صاحب نے فوراً مسئلہ کا حل پیش کیا ”پرسوں کا اخبار تو ہو گا اس میں مضمون بہت کام کا شائع ہوا ہے اسے لے آؤ دو بارہ وہ مضمون پڑھ لیں گے۔“

الل دین اندر گیا شوک کر دو دن پہلے کا اخبار لایا۔ خواجہ صاحب خوش ہو گئے۔

ایسا وضع دار ایسا وقت کا پابند آدمی اگر ایک دن ن آئے اور پھر دوسرے دن بھی ن آئے تو تجویز ہوتا ہے کہ آخر کیوں نہیں آیا۔ مگر مجھے بعد میں بیگم کو پہلے کرید ہوئی۔

”کیا بات ہے کل سے تمہارے خواجہ صاحب نہیں آ رہے۔“

”چلو اچھا ہے تم بہت بور ہوتی تھیں۔“

”ہاں کسی طرح ٹل جائیں تو اچھا ہی ہے جتنی دیر بیٹھے رہتے ہیں میرا خون جلتا رہتا ہے۔“

”بیچارے خواجہ صاحب۔“

”بیچارے و چارے وہ کوئی نہیں ہیں گا نئھ کے بہت پکے ہیں۔ دانت سے پیسے کپڑتے ہیں۔ اخبار پڑھنے کا تو بڑا شوق ہے۔ مگر اخبار خریدنے سے جان جاتی ہے ایک ہم بے وقوف انہیں مل گئے ہیں صبح ہوئی اور آن دھمکے۔“

”مگر تم ان کے اصول کی داد نہیں دیتیں۔ اخبار پڑھنے کے لئے آتے ہیں تو صرف اخبار ہی پڑھتے ہیں اور کوئی بات نہیں۔“

کرتے۔"

"ایسے اصول والے ہیں تو خود اخبار کیوں نہیں خریدتے ہیں۔"

"بس ہمارے گھر آ کر اخبار پڑھنے کی عادت جو ہوئی۔"

"یا شاید اس طرح وہ اب اجان کی یاد کو اپنے اندر تازہ رکھتے ہیں۔"

مگر دو دن سے کیوں نہیں آئے۔ اب مجھے کریڈ ہوتی کہیں انہیں یہ احساس تو نہیں ہو گیا کہ اس گھر میں ان کی آمد پسند نہیں کی جاتی۔

"اچھا تو وہ ہم سے بگز گئے ہیں۔"

"شاید"

"بگزتے ہیں تو بگز جائیں۔ آتے تھے تو ہمیں کیا دے جاتے تھے نہیں آجیں گے تو ہم کون ہی فتح سے محروم ہو جائیں گے۔"

الدوین نے میز سے ناشتے کے برتن اٹھاتے خواجہ صاحب کا ذکر سننا اور اطلاع دی۔ "بیگم صاحب جی خواجہ صاحب تو لبے پڑے ہیں۔"

بیگم گھبرا کر۔ "کیوں۔ کیا ہوا۔ خیر تو ہے....."

"بیگم صاحب جی خواجہ صاحب کا غسل فانے میں پاؤں پھصل گیا بس جی لبے لیٹ گے۔ ٹانگ میں بہت چوت آئی ہے۔" میں بس دفتر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا مگر بیگم نے مجھے صورتحال کی تلکی کا احساس دلا دیا۔

"سن رہے ہوا الدوین کیا کہہ رہا ہے۔ بڑھاپے کی چوت ہے اللہ خیر کرے۔"

"بہت برا ہوا میں بھی سوچ رہا تھا کہ آخر خواجہ صاحب آئے کیوں نہیں۔ وہ تو اپنے وقت کے بڑے پابند تھے ان کی نماز قضا ہو سکتی تھی یہاں آنا اور اخبار پڑھنا قضا نہیں ہو سکتا تھا۔"

مگر بیگم زبانی کلامی ہمدردی پر قائم نہیں ہوئی۔ تقاضا کیا کہ خواجہ صاحب کو دیکھنے چلو۔

"مگر دفتر کا وقت ہے ادھر گیا تو دفتر کو دیر ہو جائے گی۔"

"کسی باتیں کر رہے ہو آدمی سے بڑھ کر تو دفتر نہیں ہے ایک دن دفتر نہ جاؤ گے تو کیا قیامت آجائے گی۔"

بیگم کے اس رد عمل نے میرے اندر ایک احساس جرم پیدا کر دیا کہ میں کتنا بے حس ہوں اور بیگم جو یوں خواجہ صاحب سے بیزار

رہتی ہے کتنی دردمند خاتون ہے تو دفتر کا نیاں چھوڑ کر میں نے خواجہ صاحب کی عیادت کے لئے جانے کی خانی۔

خواجہ صاحب مجھے اور بیگم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

”خواجہ صاحب یہ کیا کر لیا آپ نے۔“

”بس پینا کیا بتائیں۔ غسل خانہ گیلا تھا پاؤں پھسل گیا۔“

”کیا چوتھی زیادہ آئی ہے۔“

”تکلیف بہت زیادہ ہے۔ بس اللہ نے اتنا حرم کیا کہ ہڈی سلامت رہی۔“

بیگم نے نکلا اکھا یا اس کے لئے تو شکرانے کی نماز پڑھنی چاہئے بڑھاپے کی ہڈی مشکل ہی سے جڑتی ہے۔“

”ہاں پھر تو ہم چلنے پھرنے ہی سے رہ جاتے۔“

میں نے پوچھا اب ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔

”کہتا ہے آرام کرو۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب اتنا چلنے پھرنے کے قابل بنا دیجئے کہ کرامت میاں کے یہاں جا کے اخبار پر ایک نظر ڈال لیا کروں۔“

”اجی اخبار کیا ہے۔“ بیگم نے کہا وہ تو میں ابھی اللہ دین کے ہاتھ بھجوادوں گی۔“

”نہیں نہیں۔“

میں نے کہا خواجہ صاحب اس میں کیا ہر ج ہے اخبار روز صحیح اللہ دین کے ہاتھ بھجوادیا کریں گے۔

”نہیں نہیں۔ ہم نے زندگی میں پلنگ پر لیٹ کے کبھی اخبار نہیں پڑھا۔“

خواجہ صاحب کی بیٹی رشیدہ بولی ”میں نے اخبار کل بھی منگایا تھا۔ آج بھی منگایا ہے مگر اب ابھی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“

بس اس روز سے بیگم نے روز کا یہ معمول بنایا کہ ناشست سے فراغت پا کر ادھر میں دفتر کی طرف روانہ ہوا ادھر بیگم اخبار بغل میں داب خواجہ صاحب کی طرف۔ خواجہ صاحب اخبار تو نہیں پڑھتے تھے مگر اس بھانے خواجہ صاحب کی خیریت تو معلوم کر لیتی تھی۔

”بیگم کیا حال ہے اب خواجہ صاحب کا۔“

”اب تو اٹھنے پڑنے لگے ہیں۔ بلکہ کل تو ہمارے سے چل کر برآمدے ہو گئے۔“

”بہت جلد Recover کر لیا۔“

”ہاں اللہ نے رحم کیا۔ میں تو ذرگئی تھی بڑھاپے میں ایک دفعہ کمر چار پائی سے لگ جائے تو پھر مشکل ہی سے احتراہ ہے تم نے تو اس دن کے بعد جا کر وہاں جھاٹکا ہی نہیں۔“

”کیا بتاؤں وفتر نے آج کل مجھے اتنا الجھا کے رکھا ہے وقت ہی نہیں ملا بہر حال تم نے تو ان کی بہت عیادت کی۔“

”میں تو جب تک ایک مرتبہ جا کے خیریت معلوم نہ کرلوں چین نہیں آتا تمہاری طرح میراخون سفید نہیں ہوا ہے۔“

بیگم کے اس طعنے سے مجھ پر تو گھزوں پانی پڑ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ دروازے کی گھنٹی بھی اللہ دین تیزی سے پکن سے نکل کر دروازے پر گیا اور واپس آ کر پڑ مردہ سنایا ”خواجہ صاحب آئے ہیں جی۔“  
خواجہ صاحب.....؟ اچھا.....؟ ہم دونوں ہی حیران رہ گئے۔

خواجہ صاحب چھڑی لکھتے ہوئے آہستہ آہستہ داخل ہوئے میں نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔

”لاؤ بیٹے آج کا اخبار دکھاؤ، آنکھیں اخبار کے لئے ترس گئیں۔“

میں نے اخبار خواجہ صاحب کے حوالے کیا۔ خواجہ صاحب نے آج کتنی بے تابی سے اخبار سن چالا جیسے بھوکا آدمی کھانا دیکھ کر ٹوٹ پڑے۔

بیگم نے آکر مزاج پر سی کی۔ ”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔“

”بہت بہتر ہے دیکھو جل کر یہاں تک آ گیا ہوں۔“

”ابھی آپ کو اتنا نہیں چلنے چاہئے.....“

”کیا کرتے بیٹی کتنے دنوں سے اخبار نہیں دیکھا تھا۔“

”میں تو روز آپ کے لئے اخبار لے کر پہنچتی تھی۔“

”بیٹی تمہارا شکر یہ مگر عمر بھر تو یہاں آ کے اخبار پڑھا اور جگہ بیٹھ کر اخبار پڑھنے کی کوشش کروں تو آنکھیں ہی اخبار کو قبول نہیں کرتیں۔“

یہ کہتے کہتے خواجہ اخبار پر جھک گئے ہم نے بھی موقعہ غنیمت جانا اور وہاں سے سرک آئے اصل میں آج چھٹی کا دن تھا دوستوں اور ان کی بیگمات کے ساتھ ایک پنک کا پروگرام ملے تھا سو ہمیں جلدی ہی گھر سے لکھنا تھا اور یہ سوچ کر کہ ہم تو گھر ہوں گے نہیں ال دین کو بھی ایک دن کی چھٹی دے دی جائے سو میں اندر جا کر جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگا اور بیگم بھی بننے سنور نے میں مصروف

ہو گئیں۔

بیگم نے اپنے سک لگاتے لگاتے ڈرائیور میں جانکا ”خواجہ صاحب تو آج آ کر جمی گئے ہیں۔“

”اچھا بھی تک ان کا اخبار ختم ہی نہیں ہوا۔“

بیگم نے جلدی جلدی اپنے سک لگاتے لگاتے ایک دفعہ پھر بال سنوارے ہر زاویے سے چہرے کو آئینہ میں دیکھا۔  
ایک بار پھر ڈرائیور میں نظر ڈالی۔

”اچھی دیکھ رہے ہو خواجہ صاحب تو اٹھتی نہیں رہے یہ بڑی مشکل ہے۔“

بیگم نے بڑھی سے کہا ”پھر آپ نے انہیں پیچھے لگایا۔ انہیں کسی طرح رخصت کرو۔“  
”وکھوئی گام اب میں بری الذمہ ہوں اب خواجہ صاحب تمہاری آسامی ہیں۔“

”میری آسامی کیسے ہیں جی۔“

میں تو ان کی بیماری کے دنوں میں بہت کوئی درہا ہوں تم ہی دوڑ دوڑ کے ان کی عیادت کو جاتی تھیں۔  
”وہ تو انسانی ہمدردی تھی۔“

”بس ہمدردی ہی ہمدردی میں آدمی مارا جاتا ہے بہر حال چل کر دیکھتا ہوں۔“

ٹائی درست کرتا ہوا میں ایک عجلت کے ساتھ ڈرائیور میں گیا۔ بیگم بھی تیار ہو چکی تھیں پیچھے پیچھے وہ بھی آگئیں۔

”خواجہ صاحب آپ آنکھوں پر زیادہ زور مت ڈالیں۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہئے۔“

بیگم نے نکل رکھا یا ”ہاں بھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے، اور فوراً مجھ سے مخاطب ہوئیں۔“ آپ انہیں پہنچا کر آگئیں تا.....  
”نہیں بیٹھے میں خود جا سکتا ہوں۔“

اسی گھنٹی اللہ دین اخباروں کا ایک ڈیمیر لے کر نمودار ہوا وہ پورا ڈھیر اس نے خواجہ صاحب کے سامنے ڈال دیا۔  
میں حیران ہوا ”یہ کیا.....؟“

”خواجہ صاحب بولے“ یہ میں نے منگائے ہیں میں نے سوچا کہ پچھلی تاریخوں کے جو اخبار پڑھنے سے رہ گئے ہیں ان پر ایک  
نظر ڈال لوں میاں یا اچھا کرتے ہو کہ اخبار محفوظ رکھتے ہو۔“

یہ بات سن کر میری تو سُنی گم ہو گئی۔ بیگم بھی سخت بدھوں نظر آرہی تھیں۔ کتنی غصیل نظر وہ انبہوں نے مجھے گھورا۔

”خواجہ صاحب..... میں نے جھوکتے جھوکتے کہا ”آپ یہ سب اخبار پڑھیں گے۔“

خواجہ صاحب نے اخبار پڑھتے پڑھتے اطمینان سے جواب دیا ”ہاں میں“

”مگر خواجہ صاحب اتنے اخبار پڑھنے کے لئے تو پورا دن چاہئے۔ اور آپ ابھی بیماری سے اٹھے ہیں۔“

کوئی بات نہیں خواجہ صاحب نے بے اعتمانی سے کہا اور اخبار پڑھنے میں غرق ہو گئے۔



## خالی پنجرہ

اس روز ہم نے بھرے دوستوں کی گزری صحبتوں کو بہت یاد کیا۔ تین دوست جو اکٹھے ہو گئے تھے۔ عارمندان سے اچانک آنکھا۔ وہ بھرہاتھا کہ چند اسی طرح جبی ہو گی۔ اور اسی طرح صحبتیں ہوتی ہوں گی۔ وہ توکلڑی میں سے بس اپنے آپ کو کم سمجھ رہا تھا۔ یہ اس کے گمان میں کب تھا کہ پوری لکڑی ہی تقریباً ہو چکی ہے۔ کہنے لگا کہ مجھے یہاں کون سا کام تھا۔ کام تو کراچی میں تھا۔ سوچا کہ چلو ادھر کا بھی پھیرا لگا لو۔ دوستوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ مگر کمال ہو گیا۔ ہم چند برسوں کے لئے غائب ہوئے تھے۔ ادھراتے میں دنیا ہی بدلتی ہے۔

”چلو امان اللہ کی طرف چلتے ہیں۔“ میں نے تجویز پیش کی۔ کم از کم ایک دوست ابھی شہر میں موجود ہے۔

”کیا حال ہے اس کا۔“

”بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے تھوڑی شرمندگی محسوس کی۔ ”اچھا ہی ہو گا۔ آزاد بندہ ہے۔ وقت اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

”کب سے نہیں ملتے۔“

”یار زمانہ ہی ہو گیا ملے ہوئے۔ شرمندگی کا احساس اور بڑھ گیا۔ واقعی کتنے زمانے سے امان اللہ سے نہیں ملا ہوں۔ کیا وقت تھا گھری بھر کے لئے بھی جدا ہونا گوار نہیں تھا۔ صبح ہوئے شام پڑے رات گئے محفل جبی ہے۔ گپ بازی ہو رہی ہے اور اب کیا وقت ہے کہ گئے دنوں کی یاد ایک دوست شہر میں رہ گیا ہے اس سے کبھی کبھار کی ملاقات بھی موقوف ہے۔ اس بے تعلقی کی کوئی وجہ کوئی سبب نہیں۔ بس ہے۔ دوستیوں میں عجب ہوتا ہے۔ ایک وقت میں اتنا اخلاص کہ ملے بغیر روٹی ہضم نہیں ہوتی دوسرے وقت میں یہ عالم کر ایک شہر میں مگر نہ میں نہ ملاقات جیسے کبھی تعلق ہی نہیں تھا۔ صحبت جب تک جبی ہے سو جبی ہے۔ انکھڑ جائے تو دوست سے دوست پارہ پتھر دور۔

”چلو پھر امان اللہ ہی کی طرف چلتے ہیں۔ وہیں محفل جائے گی۔“

ہم فوراً ہی ادھر چل کھڑے ہوئے امان اللہ کا گھر تو ہمارا مرغوب پڑا۔ امان اللہ چھری چھانٹ آدمی۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی

بیچھے۔ جب منہ اٹھا وہاں جادھمکے۔ دروازہ اس گھر کا ہم پر ایسے کھلتا جیسے ہمارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ اب بھی جب ہم دونوں پہنچے ہیں تو دروازہ اسی بے تکلفی سے کھلا اور اسی بے تکلفی سے ہمارا خیر مقدم ہوا جیسے ہماری آمد توقع اور معمول کے مطابق ہو۔ ”آگے استاد آجائو۔“ اور چند ضروری رسی کلمات کے بعد ایسے گھلے ملے کہ جیسے کبھی جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ امان اللہ مجھے آڑے پا تھوں لے گا کہ دوسرے یا رتو شہری سے دفع ہو گئے مگر تو نے شہر میں ہوتے ہوئے کہاں منہ چھپا لیا۔ گمراش ٹکوے شکایات میں ذرا جو وقت ضائع کیا ہوا یہے با تین شروع کر دیں جیسے ملاقاتوں میں کبھی کوئی وقفہ آیا ہی نہیں تھا۔

”یار تمہارے بعد حفیظ بھی ادھر ہی کہیں دفعان ہو گیا تھا۔ اس کی کچھ خیر خبر ہے۔“

”ہاں ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی بتا تھا کہ مانچستر میں ہے۔“

”وہاں کیا کرتا ہے۔“

”ادھر جانے والوں کے متعلق نہیں پوچھنا چاہئے۔ وہاں کے دھنے یہاں سمجھ میں نہیں آسکتے۔

”ہاں جیسے رشید کے متعلق سن کر نیو یارک کے کسی ہوٹل میں برلن دھونے پر لگا ہوا ہے۔ میں نے تعجب کیا کہ میرے یار نے یہ کیا کام پکڑا ہے۔ مگر۔

”میں نے امان اللہ کی بات کافی۔“ یار رشید نے تو کمال کیا۔ کوئی سان گمان ہی نہیں تھا۔ اچانک نکل کھڑا ہوا۔

”نیو یارک کے ہوٹلوں کے جھوٹے برلن اسے پکار رہے تھے۔“ امان اللہ نے نکلا گایا۔

”اور شمار؟ وہ کہاں گیا۔“

”نشار وہی چلا گیا۔ اور بھٹک گیا۔ اچھی کمائی کر رہا ہے۔“

عامر نے ایک دوست کے کوائف معلوم کئے۔ ہم نے ایک دوست کا احوال اسے سنایا۔ پھر پرانی صحبتوں کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ بسری با تین گزرے قصے امان اللہ تھیں وہ یاد ہے جب..... اور امان اللہ کے لئے ہر ایسے اشارے نے تھی کہ کام کیا۔ کس لطف کے ساتھ اس نے گزری صحبتوں کو یاد کیا اور غیرا ہم سے غیرا ہم تفصیل کو بھی کس مزے سے بیان کیا۔ زمانہ گزرنے کے بعد ہماری بے معنی باتوں میں بھی کتنے معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور غیرا ہم تفصیلات بھی کتنی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں اس وقت ہمیں اپنی ہر پچھلی صحبت تاریخی صحبت نظر آرہی تھی۔ جن باتوں سے اس وقت ہم بور ہوتے تھے اب وہ ہمارے لئے لکھ بن چکی تھیں۔ ان صحبتوں ان باتوں کو یاد کر کے ہم کتنا فنے۔ اور عامر کی بھی تور کئے ہی میں نہیں آرہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے اچانک عامر کی نظر برآمدے میں لگئے ہوئے خالی پنجرے پر گئی۔ ”یارا مان اللہ طوطا کہاں گیا۔“  
”اڑ گیا۔“

”اڑ گیا؟“ عامر بھونچ کارہ گیا۔ ”کیسے اڑ گیا؟“  
”کھڑکی کھلی رہ گئی۔ اڑ گیا۔“

”اچھا؟“..... تعجب ہے۔“

”تعجب کی اس میں کیا بات ہے۔“

میں یونہی بول پڑا۔ ”پرندہ تھا۔ اڑ گیا۔“

”پرندہ تو تھا مگر یار وہ تو ہماری ڈار میں شامل تھا۔ یاد نہیں ہم آتے تھے تو کتنا پھر کتا چکلتا تھا۔ اور ہم بھی اس کا باقاعدہ نوٹس لیتے تھے۔ اپنے کھانے پینے میں برابر شریک کرتے تھے۔“

عامر کے اس بیان پر وہ پوری تصویر میری آنکھوں میں سکھنے گئی۔ ہمارے آنے پر کتنا تر پتا تھا جیسے پنجرے کی تیلیاں توڑ کر باہر نکل پڑے گا اور کتنا شور مچاتا تھا اس کی تڑپ اس کی چیکار میں سرست کی ایک عجیب لہر ہوتی تھی۔ خم کھاتی ہوئی لال چچہا چونچ، باقی ایک دم سے ہرا۔ اور اس کی دم کتنی لمبی تھی کہ پنجرے میں کسی طور سماتی ہی نہیں تھی۔ اس کے دم سے پنجرہ رنگ اور حرارت سے لباب بھرا دکھائی پڑتا تھا۔ اور اب کتنا بے رونق کتنا اجڑا جڑا نظر آ رہا تھا۔

”یار مجھ سے ہی چوک ہوئی۔“ امان اللہ نے بہت ضبط کیا، مگر پھر شروع ہو گیا۔ ”مجھے اس پر کچھ زیادہ ہی اعتبار ہو گیا تھا۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ آخر پرندہ ہے۔ کھڑکی کھلی پڑی رہتی تھی اور میں اس پر دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کھڑکی کھلی دیکھ کر باہر نکل آیا۔ چھن میں چھل قدمی کی اور پھر خود ہی اندر آ گیا۔ میرا اعتبار اور بڑھ گیا۔ پر اس کی ایک حرکت کو میں نظر انداز کر گیا۔ کجھت یہ جو ہمارے برابر کے گھر امر و دکا پیڑ ہے اس کی وجہ سے اپنے مشکومیاں کا چال چلن گھڑا۔ جب اس پر امر و دلکتے ہیں تو طوٹے کی ڈار میں اس پر بہت اترتی ہیں۔ بس ان گھریوں میں مشکو بہت بے چین ہوتا تھا۔ سخت تر پتا پھر کتا تھا۔ بس کسی ایسی ہی گھری میں اس نے کھڑکی کھلی دیکھی اور ہماری ڈار سے ٹوٹ کر ہم جنسوں کی ڈار میں جاما۔“

”یار مشکوم کمال تھا۔“ عامر کہنے لگا ”ہمارے کھانے پینے میں اپنے آپ کو برابر کا حقدار سمجھتا تھا۔ ہم اسے دینے میں کوئی ہی کرتے یا ذرا تا خیر کرتے تو روٹھ جاتا تھا۔ پھر بہت مشکل سے متا تھا۔“

”لوروٹھنے پر مجھے ایک دن کی بات یاد آگئی۔“ امان اللہ کہنے لگا۔ ”صحیح ناشتے کے بعد میر اطورو چلا آتا تھا کہ توں کا ایک ٹکڑا پہلے مٹھوکی نذر کرتا۔ پھر توں اور روٹی کے بچے کچھ ٹکڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے کبوتروں کے لئے ڈال دیتا ایک دفعہ بے وہیانی میں پہلے کبوتروں کو ناشتہ کر دیا۔ بس مشو خال اینٹھے گئے۔ جہاں میں نے توں کا ٹکڑا پھرے میں ڈالنے کی کوشش کی اس نے میرے چوچی ماری اور بڑبڑا نہ لگا۔ اس بندے نے اس روز سارا دن کچھ نہیں کھایا۔ جیسے عورتیں انٹوائی کھوانٹی لے کر پڑ جاتی ہیں ویسے ہی میری طرف سے منہ موڑ کر آنکھیں موند کر بیٹھا رہا۔ یا رطوطا کیا تھا بالکل عورت تھا۔“ امان اللہ چپ ہوا۔ پھر آہستہ سے بولا ”بے وفائی بھی اسی کی طرح کی۔“ محمد انس بھرا اور چپ ہو گیا۔

امان اللہ اس ہو گیا تھا۔ اوس تو ہم بھی ہو گئے تھے۔ اوہر خالی پھرہ اداسی کی تصویر بنا لیک رہا تھا۔ مجھے یونہی خیال آیا کہ اب یہ پھرہ خواہ نتوہاہ یہاں کیوں لے لے کا ہوا ہے۔ اب اس کی بالکل وہی حیثیت تھی جو کسی جوڑے کے نقل مکانی کے بعد گھوٹلے کی ہوتی ہے۔ گھوٹلے اپنے مکینوں کے دم سے کتنا زندگی سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ سارے ٹکنوں میں حرارت کی ایک روجاری ہوتی ہے۔ مکینوں کی بھرت کے بعد کتنا مردہ دکھائی دیتا ہے۔ میں نے کہا ”امان اللہ یا رطوطا مشوکو بھول جاؤ۔ اب کوئی نیا رطوطا خرید لا۔ اور اس پھرے کو آباد کرو۔“

امان اللہ نے بہمی سے کہا۔ ”نہیں۔“  
”کیوں۔“

”کوئی دوسرا رطوطا مشوکی جگہ نہیں لے سکتا۔“

”پھر اس پھرے کو اتار کر پھینکو یا کہیں اندر ڈال دو۔“

”نہیں یار۔“ اب اس کے لہجے میں بیچارگی کا رنگ پیدا ہو گیا۔  
”کیوں؟“

”یار میں نے بتایا تاکہ پڑوں والے امرود پر رطوطوں کی ڈاریں بہت اترتی ہیں۔ کیا پتہ ہے کسی ڈار کے ساتھ وہ بھی چلا آئے۔ پھرے کو دیکھے تو شاید اسے اپنا چھوڑا ہوا گھر یا آجائے۔“

میں نے کہا ”کبوتروں چھوڑے ہوئے گھر کو یاد رکھتا ہے۔ کھو یا ہوا کبوتروں میں بھر بعد تک واپس آتے دیکھا گیا ہے۔ مگر رطوطا ایک دفعہ اڑ جائے تو پھر واپس نہیں آتا۔“

امان اللہ نے بڑی بے چارگی سے مجھے دیکھا بولا ”تم صحیک کہتے ہو۔ مگر میں پنجرے کی کھڑکی کھلی رکھتا ہوں اور روز صحیح کو پیاسی  
کا پانی بدلتا ہوں کہ شاید.....“

عامر جواب افسردا اور چپ تھاتا شیدی لہجہ میں آہستہ سے بولا۔ ہاں شاید.....



## آخر بھائی

آخر بھائی کو میں نے زمانے بعد دیکھا اور حیران ہوا۔ یہ وہ آخر بھائی تھے ہی نہیں۔ وقت کے ساتھ آدمی کتنا بدلتا ہے۔ بیٹے کوڈاٹ پچنکار رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”آخر بھائی، آپ غریب پر کیوں برس رہے ہیں۔“  
بولے ”بے ایمان کہتا ہے کہ شادی نہیں کروں گا۔ میں نے کتنا سمجھایا مگر وہی مرغے کی ایک ناگ۔ اس کی سمجھ میں بات ہی نہیں آتی۔“

میں ان کا منہ ملنے لگا۔ مجھے پرانے آخر بھائی یاد آگئے۔ کیا آزاد مخلوق تھے۔ جان کے ساتھ کوئی روگ پالا ہی نہیں تھا۔ دنیا جہاں کے قصور سے آزاد۔ نے غم دنیا نے غم کالا۔ اپنے حال میں مگن۔ من موجی۔ جس وقت جو لمبر آئی اس پر چل پڑے۔ گھر سے نہیں نکلے تو بالکل ہی نہیں نکلے۔ کمرے میں بند پڑے ہیں۔ سگریٹ کا دھواں اڑا رہے ہیں۔ کتاب پڑھ رہے ہیں۔ کئی کئی دن اسی عالم میں گزر جاتے تھے کہ نہ باہر نکلانا آسان دیکھتا۔ سنک سنوار ہوئی تو گھر سے نکل پڑے۔ پھر کئی کئی دن کے لئے گھر سے غائب۔ جب دوست کے گھر پہنچ گئے بس وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ چائے کا دور چل رہا ہے اور فلاش کی بازی لگ رہی ہے۔ پتوں میں ایسے غلطان کی خبر ہی نہ ہوتی کہ کب دن ڈھلا کب رات ہوئی۔ اپنا ہی ہوش نہ رہتا دن رات کس گفتگی میں تھے۔

دو چیزوں سے آخر بھائی بہت بد کرتے تھے۔ شادی اور ملازمت سے۔ بد کنا چاہئے بھی تھا۔ پھر تو آدمی کے پاؤں میں بیڑاں پڑ جاتی ہیں۔ آخر بھائی بتائی ہو شو و حواس پاؤں میں بیڑاں کیسے پہن سکتے تھے۔ خیر ملازمت کرنے کی تو انہیں یوں بھی ضرورت نہیں تھی۔ والد صاحب اتنا چھوڑ گئے تھے کہ مزے سے گزر بر ہوتی تھی۔ بھائی بہن کوئی تھا ہی نہیں۔ ماں نے ایک ہی پوت جانا تھا۔ اور جن کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ بس ایک پھوپھی جان کا سایہ سر پر تھا۔ جائیداد سے اتنی آمدی تھی کہ فلاش میں سینکڑوں ہارنے کے بعد بھی ہاتھ کھلا رہتا تھا۔ پھوپھی جان کو باقی جو بھی شکایتیں ہوں خرچ کے سلسلہ میں انہیں کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ اور بھی انہیں کون سی ایسی شکایتیں تھیں۔ بس ایک ہی رونا گا نا تھا کہ بیٹے شادی نہیں کرو گے تو باپ کی نسل آگے کیسے چلے گی۔ جوں جوں آخر بھائی کی عمر بڑھ رہی تھی توں توں پھوپھی جان کا رونا گا ناز و رپکڑ رہتا تھا۔

آخر بھائی کی عمر اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ کنٹی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم دوستوں میں وہ سب سے بڑے تھے۔

ای لئے کبھی بھی بزرگ بھی بن جاتے تھے۔ اور وہ ہر پھر کرشادی کا موقع ہوتا تھا۔ جو دوست شادی کرنے لگتا پہلے اسے سمجھاتے کہ میاں کس جھیلے میں پڑ رہے ہو۔ جب دوست باز نہ آتا تو پھر برائیوں میں سب سے آگے نظر آتے۔ دوپہر کا باب پچھے ہوتا وہ آگے آگے ہوتے۔

آخر بھائی کے دوستوں کے حقوق میں ہم سب ہی تھے۔ لیکن نصر اللہ سے آخر بھائی کو زیادہ ہی انس تھا۔ شاید اسی لئے انہوں نے شادی کے معاملہ میں زیادہ سمجھایا کہ یار جانے دے۔ پھنس جائے گا۔ بلکہ جب سہرا بندھ گیا اور نصر اللہ کا رہا میں میٹھنے لگا تو انہوں نے کان میں کہا کہ اے ناعاقبت اندیش! اب بھی وقت ہے۔ سوچ لے۔ مگر یہ مشورہ بھی دوستوں کے قہقہوں میں گم ہو گیا۔ آخر بھائی بولے ”میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ باقی قسمت کے لکھے کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور اس کے بعد وہ برات میں پیش پیش دیکھے گئے۔ حتیٰ کہ جب نکاح کے وقت جھگڑا کھڑا ہوا تو اس وقت بھی وہ پیش پیش رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس معاملہ میں ان کی ایک پیش نہ گئی۔ جھگڑا عجب کھڑا ہوا۔ بس ایک تینیکل مسئلہ تھا کم از کم آخر بھائی کی نظر میں تینیکل مسئلہ تھا۔ کہتے تھے کہ صبغہ کا مسئلہ محض ایک تینیکل مسئلہ ہے۔ نکاح یوں پڑھا جائے یادوں پڑھا جائے کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر فریقین کے لئے یہ دین ایمان کا مسئلہ تھا۔ سید صدر علی آخر میں نیچے پڑ گئے تھے کہ چلو بغیر صبغہ کے ہی نکاح ہو جائے مگر پرانی اس وقت تک سر سے اوچا ہو چکا تھا۔ آخر بھائی نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھانہیں رکھی۔ نصر اللہ کے والد صاحب کو بہت سمجھایا کہ جانے دیجئے اس جھگڑے کو۔ برات واپس لے جانا بہت غیر شریفانہ حرکت ہے۔ مگر انہوں نے آخر بھائی کی ایک نہ سنی۔ آخر بھائی کا امن مشن فیل ہو گیا۔ برات واپس ہو گئی۔

آخر بھائی اپنے امن مشن میں ناکام ضرور ہوئے مگر اپنے موقف سے وہ منحرف نہیں ہوئے۔ واپس جاتی ہوئی برات کے ساتھ واپس جانے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ غصیلی نظروں سے نصر اللہ کو دیکھا ”مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم اتنے ذلیل آدمی ہو۔“ پھر نصر اللہ کے والد سے کہا ”معاف کیجئے میں آپ لوگوں کے ساتھ واپس نہیں جا سکوں گا۔“

”یہیں رہو گے؟“

”یا آپ کا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔ آپ اپنے بیٹے کو تو جوں کا توں لے جا رہے ہیں۔ آپ کے اطمینان کے لئے یہ بات کافی ہوئی چاہئے۔“

برات کے واپس جانے کے بعد آخر بھائی نے سید صدر علی سے اس طرح معدرت کی اور اس طرح پشیمانی کا اظہار کیا جیسے سارا تصور انہی کا تھا۔ پھر علاقی کی تھانی اور دولوک اپنے آپ کو نصر اللہ کے بدл کے طور پر پیش کر دیا۔

یہ پیشکش اتنی اچا کنک اور غیر متوقع تھی کہ سید صدر علی پڑھا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا جواب دیا جائے۔ سمجھ میں بھی کیسے آتا۔ اس وقت ان کے ہوش ہی بجا نہیں تھے۔ ایسے میں ان کے بھائی سید حیدر علی نے ہوشمندی و کھانی۔ اختر بھائی سے انسانیت کے ساتھ بات کی۔ ”میاں ہم تو تم سے واقف ہیں۔ اچھے خاندان سے ہو۔ مگر تم نے بھی ہماری لڑکی اور ہمارے خاندان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کر لی ہوتی تو اچھا ہوتا۔“

”میں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“

”یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ صیغہ کے سوال پر یہ بھگڑا کھڑا ہوا تھا۔“

”یہ مخفی میکنیکل مسئلہ ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”تم نے اپنے بزرگوں سے بھی پوچھ لیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ آخر کوئی سرد ہڑ تو ہونا چاہئے۔“

”اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو فون لائیے میں پھوپھی جان کو بلوائے لیتا ہوں۔“

جھٹ پٹ پھوپھی جان کو فون کیا گیا کہ چھوپھاروں کی ایک تھالی لے کر آجائیے پھوپھی جان پڑھا گئیں۔

”ارے پینا یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ کوئی گزیوں کا کھیل ہے۔ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ پہلے سوچو سمجھو۔ ہتھیلی پر سروں مت جماو۔“

”پھوپھی جان“ - Now or Never

بیٹے تمہاری یہ ہست میری سمجھ میں نہیں آتی۔

”پھوپھی جان“ مطلب یہ ہے کہ آپ کے بھتیجے کی شادی اب اسی وقت اسی گھڑی ہو گئی تو ہو گئی ورنہ پھر کبھی نہیں ہو گی۔ سوچ لیجئے۔

پھوپھی جان بھی بھتیجے کے مزاج کو خوب سمجھتی تھیں۔ یہ سن کر فوراً اٹھ کھڑی ہو گئیں۔

اختر بھائی براتی بن کر سید صدر علی کی ڈیوڑھی پر گئے تھے۔ داماد بن کرواپس ہوئے۔ بس اس کے بعد ہی سے اختر بھائی بدلا شروع ہو گئے۔ ملازمت تو میرے ہوتے ہوئے ہی کر لی تھی۔ یہاں کا جواکلوتا کالج تھا اسی میں تکھرار ہو گئے۔ پھر میں ملازمت کے سلسلہ میں باہر چلا گیا۔ پھر باہر ہی رہا۔ گھروالے خود ہی چلے آئے۔ میں کسی تقریب میں یہاں کا پھیرا لگاتا۔ اب آتا تو یہاں کی زندگی کی بدلتی ہوئی تھی۔ عرصہ بھی تو بہت لمبا ہے۔ اس عرصے میں اختر بھائی ایک بیٹی ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ ایک داماد کے خسر بن

گے۔ اب اس فکر میں تھے کہ بیٹے کی شادی کر کے فراغت حاصل کریں کہ دنیا سے سکون و اطمینان سے رخصت ہوں۔  
”تم نے دیکھا ہے آج کل کی اولادوں کا حال۔“ اختر بھائی اس کے چلے جانے کے بعد بولے۔



## مشکنہ

مشکنہ بہت تھک گیا تھا اور سونا چاہتا تھا۔ تھکنا تو اسے تھا ہی۔ لڑائیاں جو بہت لڑی تھیں۔ لڑائیاں بھی ایسی ویسی نہیں۔ جب دیوتاؤں اور اسرؤں کے بیچ رن پڑا تھا تو یہ مٹی کا پتلا اور زمین کا باسی بھی میدان میں جاؤ کردا اور دیوتاؤں کے کندھے سے کندھا لاما کرایا لڑا کر اسرؤں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اس کی اسی بہادری سے خوش ہو کر دیوتاؤں نے اسے ایک انوکھی طاقت بخش ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں دشمنوں کے لئے قہر پہلے ہی بھرا رہتا تھا اب اس میں یہ طاقت پیدا ہو گئی کہ جسے قہر کی نظر سے دیکھا وہ جل کر بھسم ہو جاتا۔

مشکنہ جب اسرؤں سے بیٹ کر پلانا تو تپ میں بیٹھے رشیوں نے دہائی دی کہ اے راجہ تو آسمانوں میں جا کر اسرؤں سے لڑا۔ مگر کچھ زمین کی بھی تو فکر کر۔ یہاں بنوں میں راکشس دندناتے ہیں اور ہماری تپ میں کھنڈت ڈالتے ہیں۔ مشکنہ نے یہ سن کرتا تو کھایا اور راکشوں سے بھڑگیا۔ کتوں کو اس نے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور جلا کر راکھ کر دیا۔ جو نجع گئے وہ ایسے بھاگے کہ بن میں دور دوستک ان کا پتہ نہیں تھا۔ تپ ون راکشوں سے پاک ہو گیا۔ رشیوں نے مشکنہ کو سینکڑوں دعا میں دیں۔

یہ خبر سن کر اسرؤں سے نکلی اور راکشوں کا زور توڑا۔ کچھ ان راجاؤں کا بھی اپائے کر جو اسرؤں اور راکشوں سے بڑھ کر پاپی ہیں اور پر جا کے لئے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ مشکنہ یہ درد بھری دہائی سن کرتا تو میں آیا اور ان راجاؤں پر پل پڑا۔ ایک ایک پاپی راجہ کو مٹھکا نے لگایا اور انیاۓ کو ختم کیا۔ ان راجاؤں کی ستائی ہوئی پر جانے سکھ کا سانس لیا۔

یوں مارا مار کرنے کے بعد مشکنہ اپنی راجدھانی کو لوٹا۔ اتنا چاری راجاؤں سے بن اور نگر پاک ہو چکے تھے۔ اب چاروں طرف شانقی ہی شانتی تھی۔ مشکنہ نے سوچا تھا کہ اب وہ نچخت ہو کر راج کرے گا اور جتنا کے بھلے کے کام انجام دے گا۔ مگر اس نے ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ اسے تھکن نے آیا۔ تھکن نے اور نیند نے۔ سُنگھاسن پر ایک دن بیٹھنا اسے نصیب نہ ہوا۔ بھرے دربار سے یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ متزوں میں بہت تھکا ہوا ہوں سونا چاہتا ہوں۔

راج محل کب سے سونا پڑا تھا۔ اب جو راجہ واپس آیا تو جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ پورے محل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بر سر کا سناٹا ٹوٹا۔ خوشی کے گیت گائے جانے لگے۔ فضا میں قہقہے گو نجخنے لگے۔ مگر جس آدمی کو نیند آ رہی ہوا سے کچھ بھی بھلا نہیں لگتا نہ بھی دلگی نہ گیت نگیت۔ راج محل کی چھل پہل راجہ کو اکھرنے لگی۔ دل میں سوچا کہ یہاں تو بہت شور ہے۔ میں سوؤں گا

کیسے۔ جی میں عجب سائی کہ راج م محل سے نکلا اور کسی چپ گلہ پر جا کر بھی تان کر سور ہو۔ سواس نے منتری کو ساتھ لیا اور محل سے نکل گیا۔

محل سے باہر بھی کون سی خاموشی تھی۔ راجدھانی اپنے راج کی واپسی پر خوشی منارہ تھی۔ آندھنگل گائے جا رہے تھے۔ خوشی کی تانیں لگائی جا رہی تھیں۔ چھلیں ہو رہی تھیں۔ قبیلے گائے جا رہے تھے۔ مشکنہ سارے نگر میں گھوم گیا۔ کوئی ایسا کونہ نہ ملا جہاں چپ کا راج ہوا اور وہ اطمینان سے سو سکے۔ جدھر جاؤ شور ہی شور۔ ویسے تو وہ خاموشی کا شور تھا مگر مشکنہ کو اس سے خفغان ہونے لگا۔ اسی خفغان میں وہ نگر کو چھوڑ بن میں بیٹھ گیا۔

نگر کا شور پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن بنوں کا اپنا شور ہوتا ہے۔ شیروں کی دہاڑا تھیوں کی چنگھاڑاں ڈال پیٹھی بیٹھے تھے اور اپنی بولی بول رہے تھے۔ ایک درخت پر بہت سے طوٹے بیٹھے تھے اور بہت ناگیں ناگیں کر رہے تھے۔ مشکنہ جھنجھلا گیا۔ اس نے قہر کی آنکھ سے انہیں دیکھا اور وہ سب کے سب دم کے دم میں جل کر بھسم ہو گئے۔

پاس ہی ایک برگد تلے ایک جوگی انگ پر بھجوت ملے دھونی رمائے بیٹھا تھا اس نے یہ دیکھا تو دکھ سے بولا کہ ”راج تو نے طوطوں کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

راجہ نے پلٹ کے جواب دیا؟ طوطوں نے بھی تو میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ میں نگر کے شور سے بجاگ کر بن آیا تھا۔ یاں پر پیٹھیوں نے شور پیچا کھا ہے۔ اور طوطوں کے شور سے تو میرے کان پیٹھے جا رہے تھے۔“

جوگی زہر بھری بھی ہنسا بولا ”راج آ کاش تلے تو شور ہی شور ہے۔“

”پھر میں کہاں جاؤں۔ مجھے تو نیندا آ رہی ہے یہ شور مجھے سونے نہیں دے رہا۔“

”بس اتنی سی بات تھی۔ اس میں کون سا بیچ ہے۔ یاں یہ پر بہت ہیں ان میں اتنی گپھائیں ہیں کسی گپھائیں گھس جا اور سو جا۔“

یہ بات مشکنہ کے جی کو لگ گئی اس نے گھوم پھر کر ایک اجڑا جگہ میں ایک گہری اندری کھوہ کوتاڑا۔ اس کے پیچے کشا گھاس بچھائی۔ پھر منتری سے کہا کہ میں سونے لگا ہوں تم جا کر راج کے کاچ سن جاؤ۔ میرے سوتے ہوئے راج میں سکھ چین رہنا چاہئے اور ایک بات کا دھیان رکھتا کہ کوئی یاں آ کر مجھے نہ جگائے۔ جو ایسا کرے گا میں اسے جلا کر بھسم کر دوں گا۔ بس جب نیندا پوری ہو جائے

گی تو میں خود ہی جاگ پڑوں گا اور آ کر راج سن جاؤں گا۔“

منتری یہ سن واپس راجدھانی چلا گیا۔ ادھر مشکنہ لمبی تان سو گیا۔

مشکنہ ایسا بے سدھ سویا کہ صدیاں بیت گئیں اور اس نے کروٹ تک نہیں لی۔ جیسے جنم جنم کی نیندا اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہو۔ وہ اندر کھوہ میں پڑا سویا رہا، ادھر باہر زمانہ نے کتنی کروٹیں بدل لیں سویا مویا برابر۔ مشکنہ نیند میں تھا۔ اسے کیا پتہ کہ دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ بنوں میں راکشس پھر دندن نے لگے تھے۔ بستیوں میں پاپیوں ڈھنڈوں کی بن آئی تھی۔ راجاؤں کے طور بدل گئے تھے ظلم ان کا چلن بن گیا تھا۔ لوگ ظلم کی چکی میں بڑی طرح پس رہے تھے اور متحر اگلری میں توحد ہی ہو گئی۔ راجہ کنس نے ماوں کی گودیں خالی کر دیں اور سہانگوں کے سہاگ اجائز دیئے۔ مگر اسی بیچ ایک واقعہ اور بھی ہوا۔ اسی متحر اگلری میں بسدیو کے گھر میں چاند سا بیٹا پیدا ہوا جس کا کنس کو پتہ ہی نہ چلا۔ وہ بیٹا برندا بن میں پلاڑھا۔ اور پھر کیا ہوا کہ اس نے گائیں چراتے چراتے اور بانسری بجا تے تکوار اٹھائی اور متحر امیں آ کر کنس کوٹھکانے لگا دیا۔ متحر اولوں نے سکھ کا سانس لیا مگر جلد ہی پتہ چلا کہ وہ اپنے پیچھے اپنے جیسے کتوں کو چھوڑ گیا ہے۔ سبھی ہوا کرتا ہے۔ ظالم جیتے جی ایک نظر آتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ ٹھکانے لگ جائے تو ظلم کا انت ہو جائے گا۔ جب وہ ٹھکانے لگ جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس جیسے کتنے ہی موجود ہیں۔ بسدیو کے بیٹے نے کتوں کوٹھکانے لگا یا مگر پھر بھی کتنے ہی بیچ رہے۔

نک جانے والوں میں ایک راجہ کا لیون تھا۔ مدھوسوون نے اسے چیتا ونی اس رنگ سے دی کہ ایک ہندیا میں ایک زہری ناگ بند کیا اور اس کے پاس بھیج دیا مگر کالیوں بھی ایک زہری تھا۔ اس نے جواب یوں دیا کہ ڈھیر ساری چیزوں میں ہندیا میں اندھیلیں اور ہندیا مدھوسوون کو واپس بھیج دی۔ مدھوسوون نے ہندیا کھوئی تو دیکھا چیزوں نے ناگ کا بھرتا بنادیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت شپشا یا تب نارومنی نے اس کے پاس آ کر کہا کہ ہاے بسدیو کے بیٹے کالیوں تیرے بس میں نہیں آئے گا۔ اس کی موت کی اور کے ہاتھ لکھی ہے۔

”وہ کون مائی کالاں ہے۔“

”وہ مشکنہ ہے جس کی چتوں میں اتنا قہر بھرا ہوا ہے کہ جسے وہ ایک نظر دیکھے گا اسے خاک کر ڈالے گا۔“

”ہے نارومنی مشکنہ کہاں ہے۔“

”مشکنہ تو یہاں سے دور ایک کھوہ میں پڑا سورہا ہے۔“

”منی جی اس کھوہ کا پتہ دو۔ میں مشکنہ کو جا کر جگاتا ہوں۔“

”ہے مدھوسوون کھوہ کا پتہ تو میں دیے دیتا ہوں۔ پر تو خود اسے مت جگائیو جو بھی اسے جگائے گا وہ اسے جلا کر بھسم کر دے گا۔ بس تو اتنا کر کہ اس کھوہ میں دبے پاؤں جا اور راجہ کے سرہانے جا بیٹھ۔ کالیوں تیری کھونج میں ہے۔ وہ تیرے پیچے پیچے دہاں جائے

گا۔ وہ مورکھا پنے گھمنڈ میں آ کر اسے چھبھوڑے گا۔ بس تیرا کام بن جائے گا۔“

بسدیو کے بیٹے نے ایسا ہی کیا۔ نارومی سے پتے لے کر کھوہ میں پہنچا۔ راجہ مشکنہ بے سدھ پڑا سورہاتھا۔ چکے سے اس کے سرہانے جا بیٹھا۔ کالیون اس کا پیچھا کرتے کرتے وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ ایک پرش ڈھوہ کا ڈھوہ پڑا خڑائے لے رہا ہے۔ کالیون نے اپنے گھمنڈ میں اسے ٹھوکر ماری۔ مشکنہ کی نیند میں خلل پڑا۔ آنکھ کھل گئی قہر بھری نظروں سے دیکھا کہ کون ہے جس نے اسے جگایا ہے۔ بس دیکھنا تھا کہ کالیون کھڑے کھڑے ایسے جل کر جسم ہوا جیسے بن کا سوکھا پیڑ جلے اور دم کے دم را کھکا ڈھیر بن جائے۔

کالیون پھر سونے لگا تھا کہ بسدیو کے بیٹے نے اپنی مرلی بجانی شروع کر دی۔ مرلی کی مدد لے میں مشکنہ کی آنکھوں میں بھری نیند اور غصہ دونوں بہے گئے۔ اس نے لیٹے لیٹے تھوڑی سخت آواز میں کہا۔ ”کس کی موت آئی ہے کہ میری نیند میں خلل ڈال رہا ہے۔“

”مہاراج مرلی میں نے اس کا رن بجائی ہے کہ تمہارے جانے کا سے ہو گیا ہے۔“

”تو مجھے جگانے والا کون ہے؟“

”میں کرشن کہیا ہوں۔“

”کون کرشن کہیا۔“

”بسدیو کا پتر کرشن۔ کہیا۔“

”کون بسدیو۔“

بسدیو کے بیٹے نے بسدیو کے باپ کا نام بتایا پھر بسدیو کے باپ کے باپ کا نام بتایا۔ پھر اس کے باپ کا۔ پھر اس باپ کے باپ کا مگر ہر نام پر مشکنہ نے بھی کہا کہ وہ کون ہے۔ آخر اس نے کہا کہ ”یادو کا نام تو مہاراج تم نے سنا ہوگا۔

”یسا یا کا پتر یادو۔“

”ہاں یسا یا کا پتر یادو۔“

”ہاں اس بالک کو میں نے دیکھا تھا۔ جب میں اپنے راج محل سے سونے کے لئے لکھا تھا اور انگریز پھر رہا تھا تو وہ ایک گلی میں بالکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔“

”بس مہاراج میں اسی کے بنس سے ہوں۔“

مشکنہ جیراں ہوں۔ ”اس بالک نے میرے سوتے سوتے اتنی پیڑیوں کو جنم دے دیا۔ اس نے پھر تی دکھائی یا میں لمبا سویا۔“

”مہاراج تم لمبے سوئے۔“

”آخ رکنا۔“

”بس یہ سمجھو کر جگ بیت گئے۔“

”جگ بیت گیا،“ مشکنہ نے حیران ہو کر کہا ”متر میں تریتا گیگ میں سویا تھا۔“

”اور اب کچھ جگ ہے۔“

”کچھ لگ گیا؟“ مشکنہ ہڑ بڑا کر انھیں بیٹھا ”کیا سچ کہہ رہا ہے۔“

”ہاں مہاراج میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ کچھ لگ چکا ہے۔“

”نارائن نارائن نارائن“ مشکنہ بیکل ہو کر انھیں کھڑا ہوا اور تیزی سے کھوہ سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا۔ آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر اردو گردی کیھتا جاتا تھا۔ یہ دنیا و سی تو نہیں ہے جیسی میرے سونے سے پہلے تھی اسے گمان ہوا کہ شاید وہ سوتے سے ابھی ابھی انھا ہے اس لئے اسے دنیا بدلتی بدلتی نظر آرہی ہے۔ شاید نہیں بدلتی ہے اور و سی ہے۔ اس نے ایک دفعہ تو آنکھیں ملیں اور غور سے اردو گرد نظر ڈالی۔ ارے یہ تو سب کچھ ہی بدلتا ہے۔ یہ اس کی بھجی میں نہیں آ رہا تھا۔ گھبراہٹ میں اس نے زیادہ تیز تیز چلنے شروع کر دیا۔

مہوسودن نے بڑھ کر پوچھا ”مہاراج کدھر جا رہے ہو۔“

”اپنی راجدھانی چل کر دیکھتا ہوں کہ اس کا کیا حال ہے۔ کتنے دنوں سے سنگھاسن خالی پڑا ہے۔ راج کے کتنے کام تھے جو مجھے کرنے تھے اور یہ سوچ کر چھوڑ دیئے تھے کہ ایک نیند لے لوں پھر کروں گا۔“

”مہاراج جو آخری کام تمہیں کرنا تھا۔ وہ تم نے کر دیا۔ کالیوں کوٹھکا نے لگادیا۔ باقی کام دوسرے کرتے رہیں گے۔ اور سنگھاسن کی بات یہ ہے کہ کوئی سنگھاسن کبھی خالی نہیں رہا کرتا۔“

مشکنہ نے اسے گھور کر دیکھا ”بالک تو مجھے عقل سکھائے گا اگر تو نے مجھے کچھ کی خبر نہ دی ہوتی تو میں ابھی تجھے جلا کر جسم کر دیتا۔ جا پناہستے لے اور مجھے اپنے رستے پہ جانے دے۔“ یہ کہہ کر مشکنہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

مشکنہ بتوں سے نکل کر جب بستیوں سے گزر اتواس کی آنکھیں بھی کی پھٹی رہ گئیں۔ دنیا تو اپر تک ہو چکی ہے سچ کچھ کچھ آگیا ہے۔ جس بستی سے گزر ایسی دیکھا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے سب الٹ پلٹ ہے۔ چور راجہ بنے بیٹھے ہیں راجہ چور بن گئے

بیں۔ ان پڑھوں نے ودھوانوں کا روپ دھارا ہے اور لوگ ہیں کہ انہیں سر آنکھوں پر بھار ہے ہیں۔ جو ودھوان ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا کہ کس کیتی کی مولی ہو۔ بے ہنر مند سمجھے جاتے ہیں اسونے میں تلتے ہیں۔ ہنرمند خاک پھانکتے ہیں۔

مشکلہ حیران اور پریشان تھا کہ دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ اسی حیرانی اور پریشانی میں چلتے چلتے وہ اپنی راجدھانی میں پہنچا۔ وہاں کا رنگ بے رنگ دیکھا۔ جہاں دولت کی لگنگا بہت تھی وہاں کا یہ حال کہ لوگ پھٹے حالوں پھرتے ہیں، دانے دانے کوتے ہیں، ہاہا کارچی ہے، زرا شا کی گھٹا چھائی ہے۔ راج دربار میں جھانکا تو اور بھی اچنچا ہوا پھر غصہ آیا کہ یہ بالشت بھر کا بد صورت آدمی کون ہے کہ اس کے سمجھاں پر آن بیٹھا ہے۔ سوچا کہ اسے قبر کی آنکھ سے دیکھو اور جلا کر جسم کر دو۔ ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ دربان نے آ کر کوئا کہ کون ہوا اور یہاں کیا لینے آئے ہو۔ مشکلہ پٹپٹا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ دربان سے کیا کہے اور اسے کیسے بتائے کہ وہ اس دیس کا راجہ ہے۔ اسے ایسی غیرت آئی کہ فوراً ہی پلٹ لیا۔ اور اب جو اس نے اردو گرو نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب ہی کے قد چھوٹے ہیں۔ اردو گرد چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو دیکھ کر وہ اچنچے میں پڑ گیا۔ میری راجدھانی میں سب اوچے قد کے لوگ تھے۔ وہ کہاں گئے۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں ادا سی آگئی۔ لمبا تھندہ انس بھرا۔ چھوٹے لوگوں کا زمانہ آگیا، بڑا بڑا یا اور راجدھانی سے نکل گیا۔

مشکلہ چھوٹے لوگوں کے پیچے سے نکل آیا تھا اور اب بن میں بھکلتا پھر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کہ دھر جائے۔ منه اٹھائے یونہی چلا جا رہا تھا کہ جس کھوہ سے سو کر نکلا تھا وہی کھوہ پھر سامنے نظر آنے لگی۔ دل میں کہا کہ کہاں مارے مارے پھر رہے ہواں پھر سے بہتراب تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر اسی میں گھس کر سور ہو۔

مشکلہ کھوہ کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ کیا دیکھا کہ سات آدمی کہ ساتھ ان کے ایک ستا تھا لبے ڈگ بھرتے ہوئے کسی طرف سے آئے اور اس کھوہ میں داخل ہونے لگے۔ مشکلہ نے بڑھ کر انہیں نوکا کہا کہ ”متزو یہ گھامیر استھان ہے تم یاں کیا لینے آئے ہو۔“

سات میں سے ایک نے سب کی طرف سے جواب دیا۔ ”اے عزیز ہم غریب الوطن ہیں۔ فلک کے تائے ہوئے ہیں زمانے کے راندے ہوئے ہیں۔ ہماری زمین ہم پر تگ ہوئی تو سوچا کہ اللہ کی زمین تو کشادہ ہے۔ بس نکل کھڑے ہوئے۔ رنج غریب چھپ کر یہاں پہنچے ہیں۔ راہ میں یہ غار نظر آیا تو دل نے کہا کہ اسے گوشہ عافیت جانو۔ شاہ دیقا نوس کے آدمیوں سے بھی کہ ہمارے پیچے گئے ہوئے ہیں محفوظ رہیں گے اور تھوڑی کر بھی لگا گیں کہ خستہ و درماندہ ہیں اور کتنی راتوں کے جا گے ہوئے ہیں۔“

مشکلہ نے ان کا حال سن کر ترس کھایا۔ بولا ”ہے متزو، تمہاری مت ماری گئی تھی کہ تم نے اپنی جنم بھوی چھوڑی۔ چجھے کہ دھرتی دشال ہے، پر کثھور بھی تو ہے بے ٹھکانوں کو بہت ستائی ہے۔ میری اتنی عمر ہو گئی۔ دیس دیس کی یا ترا کی ہے۔ جنم بھوی تیاگنے والے کو

میں نے کبھی سچھل ہوتے نہیں دیکھا۔

”عزیز تو نے سچ کہا۔ مگر ہمارے لئے چارہ کیا تھا۔ باڈشاہ جابر تھا۔ حق و صداقت کا دشمن تھا۔ اس فضائیں ہمارے لئے سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔ ایسی گھڑی آئی کہ اپنے بھی پڑائے ہو گئے۔“

مشکنہ نے محمد انس بھرا ”کلچک جو ہوا۔“

”کلچک؟“ ساتوں نے حیران ہو کر پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مشکنہ کا منہ سکنے لگے۔

مشکنہ کو ان پر اور بھی ترس آیا کہ ان آگیاںوں کو یہ بیک پتہ نہیں کہ ترتیباً یہ کائنات ہو چکا ہے اور اب کلچک چل رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ انہیں تھوڑی سکشادی نیچا ہے کہ جکوں کا کیا چکر ہے یہ جگ کون سا ہے اور اس میں کیا کچھ ہوتا ہے یہی کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولنے لگا تھا مگر اس نے دیکھا کہ وہ تو اب وہاں ہی نہیں۔ حیران ہوا کہ وہ کدرہ نکل گئے مگر پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اچھا ہوا وہ کہیں آگے بڑھے گئے۔ اب وہ اپنی کچھ میں جا کر اطمینان سے سوکے گا۔ مگر جب اس نے کھوہ کی طرف قدم بڑھایا تو دیکھا کہ وہ ساتوں کے ساتوں اندر سوئے پڑے ہیں۔ دل ہی دل میں جھلایا کہ مورکہ میرے استھان پر جا کر سو گئے۔ ایک ٹھنڈنا میرے سلگھاسن پر دھرنادے کے بیٹھ گیا۔ یہ سات پر دلیسی میرے بیسرے کے استھان پر آ کر پس ر گئے۔ میں کہاں جاؤں۔ اس نے طے کیا کہ انہیں اٹھا کر کہا جائے کہ یاں سے لمبے بنوکی اور جگہ جا کر ٹھنکانے کرو۔

یہ سوچ کر مشکنہ نے کھوہ کی طرف قدم بڑھایا۔ اچانک کتنے نے جھر جھری لی اور اس پر غرانے لگا کہ جیسے اس نے دوسرا قدم بڑھایا تو اس پر جھپٹ پڑے گا۔ کتنے کی یہ مجال کہ اس پر غرائے اسے بہت تاؤ آیا۔ سوچا کہ اسے قہر کی آنکھ سے دیکھو اور بھسم کر دو۔ اس نے اپنی طرف سے یہ کوشش کی مگر اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھ قہر کی نظر جو گلی نہیں رہی۔ اس بات سے وہ بہت پریشان ہوا۔ اسے لگا کہ اس کی ساری طاقت اس کی قہر کی نظر میں تھی وہ نظر گئی تو جیسے اس کی ساری طاقت چلی گئی ہو مگر یہ ہوا کیسے اور اسے سوچتے سوچتے خیال آیا کہ اس نے کہیں پرانوں میں پڑھا تھا کہ ایک ایسا سورما پیدا ہو گا جس کی دھنش کے بان کتنے ہی چلائے جائیں پر ختم نہیں ہوں گے۔ وہ بہت معركے کے مارے گا مگر ایک سے ایسا آئے گا کہ اس کی دھنش کھینچنے نہیں کھینچے گی اور اس کے سارے بان ختم ہو چکے ہوں گے۔ تب وہ سوچے گا کہ یہ اس کا انت سے ہے اور وہ دنیا سے منہ موز کر پر بتوں میں نکل جائے گا۔ یہ بات دھیان میں آئی تو اس کا جی بیٹھنے لگا۔ ایک اداکی کے ساتھ سوچا کہ سونے سے پہلے دنیا کو اس کی کتنا ضرورت تھی۔ وھری کی بات توجانے ہی دو آسانوں پر بر ایمان دیوتا بھی اس کی مدد کے محتاج تھے۔ وھری سے لے کر آ کاش تک کتنا مانگ تھی اس کی۔ سو کر اٹھا

ہے تو دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ جیسے زمانے نے اس سے منہ موڑ لیا ہو جیسے اب کسی کواس کی ضرورت نہ رہی ہو۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے ایک دفعہ پھر کچھ کے اندر نظر دوڑائی۔ وہ ساتوں آدمی سوئے پڑے تھے اور خرانے لے رہے تھے۔ کتابت کوں رہا تھا اور غرا رہا تھا۔ دنیا میں اب اس نے سوچا، میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، نہ گرمیں نہ بن میں اس خیال کے ساتھ وہ بالکل ہی ڈھنے گیا۔ میرا سے بیٹ گیا۔ اب دوسروں کے سونے اور جانے کا سے ہے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہیان کی ایک اور لہر آئی۔ تو پھر میں کیوں اس اسار سنار میں بھکلتا پھر رہا ہوں۔ اور وہیان کی اس لہرنے اسے ایسا اپنی لپیٹ میں لیا کہ بس پھر وہ ہمالہ پربت کے گھنے جنگلوں میں نکل گیا۔ ایک پیڑ تسلی سادھی لگا کر بینجا۔ آنکھیں موند لیں۔ لمبا سانس کھینچا کہ دم بند ہوا اور وہ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔



# گونڈوں کا جنگل

”آیا؟“

”نہیں۔“

”محضی کس نے بجا لی تھی؟“

”سامنے کے فلیٹ والوں کا نوکر تھا۔ اخبار مانگ رہا تھا۔“

چیزیں انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔ بڑی رائیں۔ ”جانے کہاں رہ گیا۔“ اپنے فکر مند چہرے کے ساتھ اک ذرا دیر کھڑی رہیں اور پھر ائمہ قدموں والے پس چلی گئیں۔

”میں نہیں۔“ باوا جان بولے ”یہ ساجد آئے بیٹھے ہیں۔ ان کے لئے چائے بناؤ۔“

میں انھیں لگا تھا کہ ساجد نے اسے نوکا۔ ”ابھی نہیں۔ ہو جائے گی چائے بھی۔ میں کو آجائے دو۔“

”کہیں آئے بھی،“ باوا جان فکر مندانہ لہجہ میں بولے ”دیکھ رہے ہو اس کی ماں کتنی پریشان ہے۔“

اماں نے پھر اپنے پریشان چہرے کے ساتھ کمرے میں جھانا کا جیسے انہیں کسی بات کا خیال آگیا ہو۔ ”اے بھیا ساجد اس نے تم سے کیا کہا تھا۔“

”جی اصل میں میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ شام کو بہت بوریت ہوتی ہے۔ کہیں نکل ہی نہیں سکتے۔ شام ہی کے ساتھ کر فیو کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو آج کل دن میں بھی گھر ہی پر ہوتا ہوں۔ تم دفتر سے آنے کے بعد ادھر آ جانا۔ رشید سے کہیں گے کہ وہ بھی آجائے گا۔ رات کو ادھر ہی رہ جاؤ۔ گپ کریں گے۔ کوئی اچھی پکجھل گئی تو وہ بھی دیکھ لیں گے۔“

”ہاں کئی دن سے گھر ہی پر تھا۔ کام تو پت پڑا ہے۔ نکل کے کیا کرے۔ مگر صبح ہی صبح کوئی فون آگیا۔ فوراً نی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا کہ میٹ مت جاؤ۔ دن خراب ہیں۔ کہا کہ کام نکل آیا ہے۔ ابھی بہتا کرایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ رہا ہوں۔ اچھا بھی آ رہا ہے۔ اب دن ڈھل رہا ہے اور اس کا کہیں اتا پتا نہیں۔“

یہ ساری بات انہوں نے کھڑے کھڑے کی اور پھر ائمہ قدموں لوٹ گئیں۔ ساجد کے بیٹھے بیٹھے ان کا کمرے میں یہ چوتھا

پھیرا تھا۔ اور ساجد کو آتے ہوئے کون سی اسی دیر ہوئی تھی۔ ابھی تو باوا جان نے حالات حاضرہ پر اپنا تبصرہ بھی شروع نہیں کیا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ میمن نے جا کر اٹھایا ”ہیلو..... جی..... ابھی نہیں آئے۔“

اماں لپک کر آئیں۔ ”میعنی کو پوچھ رہا ہے۔ اس سے ذرا پوچھ تو سمجھی کہ .....“

”کیا پوچھتا تھا۔ ہو گا کوئی۔“

”کس بے پرواں سے کہہ دیا کہ ہو گا کوئی۔ پتہ نہیں کون ہے۔ صبح بھی اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد فون آیا تھا۔ پھر دوپہر کو آیا اور اب پھر آگیا۔ پوچھتا ہے اور فوراً بند کر دیتا ہے۔ جانے کون ہے۔ کوئی بھیدی ہے یا کوئی ..... کہتے کہتے چپ ہو گئیں اور ساتھ ہی کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے جانے کے بعد باوا جان نے زبان کھوی۔ ”تم تو باہر نکلتے ہو۔ شہر میں آج تو خیریت رہی یا کچھ .....“

”سنا تو نہیں۔ اگر کچھ ہوا ہو گا تو کل کے اخبار ہی سے پتہ چلے گا۔“

”ہاں کل کے اخبار ہی سے پتہ چلے گا۔ پہلے تو شہر میں ذرا سی بات ہو جاتی تو دم کے دم میں پورے شہر میں پھیل جاتی تھی۔ اب یہ حال ہے کہ ایک علاقہ میں قیامت گز رجائے دوسرے علاقوں کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ ابھی پچھلے جمع کی بات ہے۔ ہم ولیم کھار ہے تھے۔ ادھر شادی گھر سے چار قدم پر دوسرا علاقہ لگتا تھا۔ وہ گولی چل گئی۔ پولیس پہنچ گئی۔ کرفیو لگ گیا اور ادھر پتہ ہی نہیں۔ ہم ولیم کھاتے رہے۔“

”لیکن سید صاحب، افواہ تو بہت جلد پھیل جاتی ہے۔“

”ہاں یہ بھی تم سچ کہو ہو۔ میاں حالات بہت خراب ہیں۔ میں تو ان دونوں لڑکوں سے سبھی کہتا ہوں کہ گھومنا پھر نابند کرو۔ میعنی کے پاؤں میں چکر ہے۔ اسے خاص طور پر تنبیہ کرتا ہوں کہ میئے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ دن رات شہر کی خاک پھاٹکتے پھر د۔ اب تو یہ ہے کہ ضروری کام کرو اور ائے پاؤں گھر آ جاؤ۔ مگر وہ سنتا کہاں ہے۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی ماں کا کیا حال ہے۔“

فون کی گھنٹی بجی۔ باوا جان بولتے بولتے رکے۔ ”میمن میئے ذرا دیکھو کس کا فون ہے۔ شاید ..... اس کا .....“

میمن لپک کر گیا۔ ”ہیلو..... اچھا بلاتا ہوں۔ پھر پکار کر کہا ”ندیم تمہارا فون ہے۔“

ندیم نے آکر فون سنا۔ چند منٹ بات کی۔ ادھر سے فارغ ہو کر ذرا انگر روم میں آیا۔

”کتنا سکور ہوا؟“ میمن نے پوچھا۔

"بس؟ بہت سلو جار ہے ہیں۔"

"ان کے بالروں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اتنی دیر ہو گئی۔ کوئی چوکا نہیں لگا۔"

"ہار تو نہیں جائیں گے؟"

"دیکھو کیا ہوتا ہے۔" کہتے کہتے کمرے سے نکل گیا۔

اماں اب گم مکھڑی تھیں۔ ساجد کی بات کا بھی کوئی رو عمل نہیں ہوا۔ اپنا اس طرح کھزار ہتا خود ہی عجب سالگا۔ خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

کمرے میں تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر میں بڑا یا۔ "بھائی جان کو پڑھے ہے کہ اماں ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہیں۔ خود بھی پریشان ہوتی ہیں، ہمیں بھی پریشان کرتی ہیں۔ مگر بھائی جان ہیں کہ....."

"میئے پریشانی کی بات تو ہے۔ یہ تو وہ زمانہ ہے کہ گھر سے باہر قدم نکالتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔"

"سید صاحب۔" ساجد بولا۔ "باہر اور اندر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آدمی اندر کون سا حفظ ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو میاں۔ بس بڑی گھڑی سے ڈرنا چاہئے۔ رکے پھر بولے۔" ایک بات میں تمہیں بتاؤ۔ پہلے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ میرے بیٹے میں نے فارست میں نوکری کی ہے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی۔ میزک کرتے ہی نوکری میں جت گیا۔ ہمارے پوچھا صاحب فارست میں کنز روپیر تھے مجھے انہوں نے اپنے مکھ میں لگوادیا۔ سی پی میں میری تعیناتی ہوئی وہاں کے جنگل الاماں۔ دن میں رات کا سماں ہوتا تھا اور رات میں یہ حالت کہ میلیوں چلتے چلے جاؤ۔ روشنی کا نام نشان نہیں۔ آدمی کا اتنا پتا نہیں۔ ایک میں ایک میرا اردوی۔ میرے پاس ایک بندوق، کارتوسوں کی ایک پیٹی اردوی کے ایک ہاتھ میں لائشیں، دوسرا میں لائشی۔ وہاں گونڈوں سے سابقہ تھا۔ جنگلی لوگ تھے۔ سخت خطرناک۔ رات کو لکڑی چراتے تھے۔ فارست والے انہیں چیک کرتے ہوئے گھبراتے تھے جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ مگر میرے ہتھے جو چڑھ گیا میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ چھٹی پر گھر آیا تو تایا جان کہنے لگے بیٹے تمہارے پھوپھانے تمہیں کہاں جھونک دیا۔ وہ تو سارا ہندوؤں کا علاقہ ہے۔ اوپر سے گونڈ بھیل اور تمہاری جنگل کی نوکری۔ تمہیں ڈرنیں لگتا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ واقعی ان دنوں مجھے ڈرنیں لگتا تھا۔ اس کے باوجود کہ میں وہاں اکیلا مسلمان تھا۔ یقین جانو بالکل ڈرنیں لگتا تھا۔ مگر اب لگتا ہے۔ اور مسلمانوں سے۔ چپ ہوئے محدث انس بھرا۔ کیا زمان آیا ہے، مسلمان مسلمان سے ڈرتا

”سید صاحب“ ساجد پوچھنے لگا۔ ”سی پی تو ساو تھیں ہے نا۔“

”یہی سمجھ لو۔ مگر میاں ہمیں تو بھی پتے چلا نہیں کہ شمال کدھر ہے اور جنوب کدھر ہے ہم کس سمت میں ہیں اور کس سمت میں جا رہے ہیں۔ جنگل میں سمت کا احساس نہیں ہوتا جنگل ساجنگل۔ شیر، چیتے، تیندوے اور آدمی کے نام گونڈ یا بھیل۔ وہ ان سے زیادہ جنگلی۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح میں بے دھڑک گشت کرتا تھا۔ بس اوپر اللہ کا سہارا تھا اور نیچے اپنے کاندھے پر رکھی بندوق کا۔ میاں اس بندوق نے میرا بہت ساتھ دیا۔ گونڈوں کو پتہ تھا کہ میرے پاس بندوق ہے۔ فسادات کے دنوں میں اسی بندوق نے ہمارے محلے کو بچالیا۔ ایک ہمارا ہی محلہ تھا جس پر حملہ نہیں ہوا۔ انہیں پتہ تھا کہ اس محلہ میں ایک گھر بندوق والا ہے۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”افسوں کے ادھر ہی رہ گئی۔ اب تو میاں ہم نہتے ہیں۔ پھر ڈرنا ہی ہوا۔“

”باوا جان،“ مینکن بولا۔ ”آپ کی بندوق اس وقت کیا کام آتی۔ بندوق تو اب طنزچہ لگتی ہے۔“

”سن رہے ہو۔ میاں ساجد۔ جب میں اپنی بندوق کی بات کرتا ہوں تو یہ لڑکے ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ کاشنگوں کا زمانہ ہے۔ ویسے تو یہ بات ٹھیک ہی ہے مگر میاں بندوق پھر بندوق ہے۔“

ندیم نے اندر رجھانا کا۔ ”بھائی جان نہیں آئے؟“

”نہیں۔“ مینکن نے مختصر جواب دیا۔

”کہاں رہ گئے۔ اماں پر یثان ہو رہی ہیں۔“

اللہ جانے کہاں رہ گئے۔ انہیں یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ اماں کتنی پر یثان ہوں گی۔ رک کر۔ مجھ اب کیسا جا رہا ہے۔“

”کھیل میں اب تیزی آئی ہے۔ ابھی تک فنی فنی کا معاملہ ہے۔ چائے کے وقہ کے بعد دیکھو کیا نقشہ لکھتا ہے، چونکہ وقفہ ختم ہو گیا۔ تیزی سے نکل جاتا ہے۔ باوا جان نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس وقت اس کا آنا انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔

”ساجد میاں دیکھ رہے ہو۔ آج کل کے لڑکے اس کھیل کے پیچھے کیسے دیوانے ہو رہے ہیں۔ اتنا تو ہم نے پنگ کے پیچھے بھی لڑکوں کو دیوانہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔“

”ہاں آج کل کر کت کا بہت کریز ہے۔“ ساجد نے مختصر اکھا۔

”میاں یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ آگے توار روکی زینت بھی جاتی تھی۔ اب بلا ہے۔ ساجد میاں انصاف کی کہنا تمہارا زمانہ

تموار کا بھی تک کوئی جواب نہیں لاسکا۔ یہ تمہارے نئے تھیار تو مشینیں ہیں۔ بن دبایا مشین چل گئی۔ اور بنن کا کیا ہے اسے کوئی بھی  
دبا دے، مرد کی قید تو نہیں ہے۔ مگر تموار.....

دروازے کی گھنٹی کی آواز سے فقرہ نیچ کے بیچ ہی میں رہ گیا۔ ”مین جاؤ۔ ویکھو۔ شاید.....“

مین دروازے کی طرف گیا۔ اماں پکی ہوئی آسمیں۔ گھنٹی بھی تھی۔“

”ہاں۔“ باواجان نے تخل کے ساتھ کہا۔ ”دروازے پہ کوئی ہے؟“

”اور کون ہوتا۔ میں جانوں کہ وہ.....“ یہ کہتے ہوئے وہ مڑ کر دروازے کی طرف جانے لگی تھیں کہ اتنے میں مین واپس آ گیا۔

”کون تھا؟ اماں اور باواجان نے بیک وقت پوچھا۔

”اوپر کے فلیٹ والے۔“

”اوپر کے فلیٹ والے؟“ جیسے باواجان یا اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ آنے والا کون تھا۔

”وہ جو نمبر تریسٹھ میں رہتے ہیں۔“

”کیا کہتے تھے؟“

”بھائی جان کو پوچھ رہے تھے۔“

”کیوں؟“

”یہ انہوں نے نہیں بتایا۔“

”تو بیٹا تو ان سے پوچھتا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا کام ہے۔“

”ہم تو انہیں جانتے نہیں۔ کون صاحب ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟“

”وکیل ہیں۔“

”وکیل۔“ باواجان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اُرے پہلے تو یہ بھی ہمارے میں کو پوچھنے آئے نہیں۔ اور میں تو جانوں میں انہیں جانتا بھی نہیں ہے۔“

”میاں ساجد، تم انہیں جانتے ہو؟“

”دہنیہں۔“

”کمال بات ہے۔ نہ تم انہیں جانتے ہو نہ ہم انہیں جانتے ہیں۔“

”اصل میں۔“ ساچد نے وضاحت کی ”میں تو قلیل و الوں سے زیادہ ملتا جلتا نہیں۔“

”میاں ہم کون سے ان سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک تمہارے سوا ہم تو نہیں جانتے کہ کون یہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔“

”مگر مٹا وکیل ہمارے گھر کیوں آیا تھا اور کیوں پوچھ رہا تھا محیں کو۔“

"اماں مجھے تو وکیل شریف آدمی لگتا تھا۔ آپ خواہ مخواہ شک کر رہی ہیں۔"

”تیرا کپا سے تو توہراٹھائی گیرے کو شریف آدمی کہہ دیتا ہے۔“

اماں جو اپنی بات کہہ کر گیری فکر میں ڈوب گئی تھیں اچانک اٹھیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

”بواہان۔“

۲۵

”اب تو واقعی فکر کی بات ہے۔ کرفیو کا وقت قریب آچتا ہے اور بھائی جان.....“

”ہوں..... پھر بیٹے بتاؤ ہم کیا کریں؟“ یاواچان نے فکر مندی سے کہا۔

کس سے پوچھا جائے۔ میں جیسے سوچ رہا ہو کہ کس سے رابطہ قائم کر کے معلوم کپا جائے۔

”اب تو واقعی معین کو آ جانا چاہئے۔“ ساجد بولا۔ سمجھ میں بات نہیں آئی کہ کیوں ابھی تک نہیں آیا جبکہ اس نے مجھے وقت بھی دے رکھا تھا۔ رشید کو بھی آنا تھا وہ بھی نہیں آیا۔ شاید اسی کے ساتھ آئے اور شاید اسی کی وجہ سے دیر ہوئی ہو۔“

"اس لڑکے نے پریشان کر دیا۔ پاؤ اچان اب بہت فکر مند نظر آ رہے تھے۔ "آج صحیح چانے ہم نے کس کامنہ دیکھا تھا۔ سارا

ہیں۔ انہوں نے خورجہ کا احوال لکھا ہے۔ بہت خراب حالات ہیں۔ اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ پاکستان میں لوگ بہت آرام سے ہیں۔“

”ہاں آج کل تو وہاں قیامتِ اٹھی ہوئی ہے۔“ ساجد بولا۔

”میاں پہلے مجھے بہت غصہ آتا تھا، ہندوؤں پر سکھوں پر یہودیوں پر یہودیوں نے کم ظلم کئے ہیں مسلمانوں پر تو مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ اب نہیں آتا۔ شاید اس لئے کہ بوڑھا ہو گیا ہوں یا شاید اس لئے کہ اتنا کچھ دیکھا کہ..... بس مت پوچھو۔ تو غصہ آگے آتا تھا۔ اب نہیں آتا۔ کسی بھی بات..... آتا بھی ہے تو خود اپنے آپ پر۔“

”ہاں حالات ہی ایسے ہیں۔“

”نہیں ساجد میاں یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ درود مندی ختم ہو گئی۔ ہمارے والد کا خدا نہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یہ حال تھا کہ ایک دفعہ شکوہ جواب شکوہ پڑھنے بیٹھے تو اتنا راوے کہ ہر کی بندھ گئی تو درود مندی تو ان لوگوں کے ساتھ چلی گئی اور ساتھ میں مسلمانی بھی۔“

ندیم گھبرا یا ہوا داخل ہوا۔ ”میں بھائی اماں دروازے پر کھڑی ہیں۔ نہیں جا کے سنبھالو۔“ بیچ آخری دمouں پر ہے۔ میں ابھی آیا۔ بہت پریشان کیا ہے بھائی جان نے اور فوراً ہی واپس ہولیا۔

میں لپک کر دروازے کی طرف گیا۔ باوا جان کی زبان کو جیسے تالا لگ گیا ہو۔ میں پکڑ دھکڑ کر اماں کو واپس لایا اور صوفے پر بخادیا۔ ”اماں اتنا تو مت گھبرا گیں۔ ممکن ہے کوئی مصروفیت نکل آئی ہو۔ آجائیں گے۔“

”آنا ہوتا تو آ جاتا۔“ اماں نے جیسے اب امید کا دامن چھوڑ دیا ہو، اب کب آئے گا۔ کرفیو کا وقت شروع ہو گیا۔

”اب وہ نہیں آئے گا۔“ اور اماں نے سکیاں لینی شروع کر دیں۔

باوا جان خاموش و سکھتے رہے۔ پھر میں سے مخاطب ہوئے۔ ”بیچے نہیں اندر لے جاؤ۔“

میں نہیں سمجھا نے بھانے لگا۔ انہوں نے آنسو پوچھے۔ بالکل چپ ہو گئیں۔

”چلیں، اندر چلیں آپ۔“

وہ انھوں کھڑی ہو گئیں اور خاموشی سے نکل گئیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے گیا۔

”پاکستان جیت گیا،“ ندیم نے اندر قدم رکھتے ہوئے اعلان کیا۔

”اچھا؟“ ساجد نے بے ساختہ کہا۔ ”ہار جاتا تو بہت کر کری ہوتی۔“

”آخری وقت تک کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو گا۔ بس آخری بال نے فیصلہ کیا چوکانہ لگتا تو رہ گئے تھے۔

”چلو عزت رہ گئی۔“ ساجد اس جیت پر کتنا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مگر اسطمینان میں ندیم والی گرم جوشی نہیں تھی۔

”اب تو فارغ ہو گئے ہو۔ جا کے ماں کی خبر لو۔“

”تو بھائی جان ابھی نہیں آئے؟..... حد ہو گئی..... کہاں رہ گئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

”کیا وقت ہو گیا؟“ باواجان ساجد سے مخاطب ہوئے۔

”کر فیوض روئے ہو چکا ہے۔“ ساجد نے کلامی پر گلی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

باواجان نے تامل کیا۔ پھر بڑاۓ ”ضرور کچھ..... فقرہ حق ہی میں چھوڑ کر چپ ہو گئے۔

”سمجھ میں نہیں آیا۔“

”اب سمجھ میں نہ آنے والی کو انہی بات رہ گئی ہے۔“

ایک تھوڑے تامل کے بعد۔ پھر میں چلوں؟“

”ٹھیک ہے۔ تم نے بہت انتظار کیا۔ اب.....“ پھر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ساجد کھڑا ہونے لگا تھا کہ دروازے کی گھنٹی

بیجی۔ ساجد ٹھہر کا ”میرے خیال میں وہ آگیا۔“

”وہ..... وہ اب کیا آئے گا۔“

انہوں نے دیکھا کہ میں انہیں اور ندیم دونوں تیزی سے دروازے کی طرف گئے ہیں۔ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے۔ وہ پلٹے تو واقعی میں ان کے ساتھ تھا۔ باواجان نے ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”ارے ساجد تم بیٹھے ہو۔ کیا بتاؤں؟“

”ہمیں بعد میں بتانا۔“ باواجان نے بات کا نتھے ہوئے کہا۔ ”پہلے اپنی ماں کو جا کر بتاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ ساجد تم بیٹھے ہونا۔ میں ابھی آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اللہ نے بڑا کرم کیا۔“ ساجد نے میں کے جانے کے بعد تھوڑے تو قف کے بعد کہا۔ ”ہم تو سمجھتے تھے کہ .....“ خاموش ہو گیا۔ باواجان کا ذہن جانے کہا تھا۔ گم بیٹھے تھے۔ ساجد پھر شروع ہو گیا۔ یہاں تو کسی وقت کا کوئی اعتباری نہیں ہے۔ فساوی کی بات تو

الگ ہے۔ یوں آپ چلے جا رہے ہیں۔ بازار میں گھما گھمی ہے۔ گولی کسی سمت سے آئی۔ آدمی ختم یا چلتے چلتے آپ اٹھانے جاتے۔ یعنی آپ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہاں“ باؤ جان نے تھنڈا انس لیا۔ کہنا تو نہیں چاہئے میاں ساجد لیکن بات منہ پر آگئی ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے۔ پاکستان ..... ہار گیا۔“

ندیم بھائی مٹھائی کا ذبہ لئے داخل ہوا۔ ”ساجد بھائی، مٹھائی کھائیے۔“

”مٹھائی؟ اچھا..... بھئی خوب مگر کس بات کی؟“

”پاکستان کے جیتنے کی خوشی میں۔“ پھر باؤ جان کی طرف ڈبہ بڑھایا۔ ”باؤ جان آپ بھی کچھ لجھئے۔“

”نہیں میئے، تمہیں پڑتے ہے کہ میرا مشنے سے پرہیز ہے۔“

ندیم جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔

باؤ جان کا ذہن وہیں الکا ہوا تھا۔ کسی سے مخاطب نہیں تھے۔ اپنے آپ ہی بڑھا رہے تھے۔ عجیب بات ہے۔ لڑا بھی نہیں اور ہار گیا..... بس اپنے آپ ہی سے ہار گیا۔

معین داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے اثرات ابھی گئے نہیں تھے۔ آکر خاموش بیٹھ گیا۔ چیچھے چیچھے چائے بھی آ گئی۔ ”ساجد چائے پیو۔ یا تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا۔“

باؤ جان انٹھ کھڑے ہوئے۔ ”لواب تم لوگ باتیں کروں۔ میں چلا۔“

”سید صاحب، چائے آگئی ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چائے نہیں پیسیں گے۔“

”نہیں میاں میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“

”یا ر ساجد سوری۔“

”مگر یا، تم نے سارے گھر کو پریشان کر دیا۔ آخر ہوا کیا تھا؟“

” بتاؤں گا۔ تم چائے پیو۔“

”تم مجھے نارمل نظر آ رہے۔ کچھ ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ یا ر چائے لوٹا۔ تھنڈی ہو جائے گی۔“

ساجد نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر چائے پینے لگا۔ وہ زیادہ باتیں کرنے کے موڑ میں نہیں تھا، جیسے اس سارے قصے نے اسے تھکا دیا ہوا اور مصین تو تھا ہی سارے دن کا تھکا ہوا۔

”میرے خیال میں تم آج خاصے بور ہوئے ہو۔ باوا جان نے بہت بور کیا ہو گا۔“

”بالکل نہیں۔ میں تو ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اور ہاں۔“ جیسے اسے اچانک یاد آیا ہو۔ ”رشید کو بھی تو تمہارے ساتھ آنا تھا۔ آیا نہیں۔“

مصین نے تامل کیا۔ پھر بولا ”نہیں..... تو قف کیا۔ پھر دھنی ہوئی آواز میں بولا۔“ اب وہ نہیں آئے گا۔“

ہاں اب کیا آئے گا۔ آنا ہوتا تو آچکا ہوتا۔ کیوں، تمہیں ملا نہیں تھا۔“

”ملا تھا..... ہم ساتھ ہی تھے۔“

”پھر؟“

ندیم خوش خوش داخل ہوا۔ ”ساجد بھائی، جیتنے کی خوشی میں ایک پکھر رہ ہو گئے۔ کیا خیال ہے۔ بھائی جان، آپ کہہ بھی رہے تھے۔ تو لگاؤں؟“

”پکھر؟ مصین جیسے ٹپٹا گیا ہو۔“ ”ساجد؟“

”نہیں یار۔ آج نہیں۔ تم بھی سارے دن کے تھکے ہوئے ہو اور میرا بھی اب پکھر دیکھنے کا کچھ موڑ نہیں ہے اور پھر رشید نے آکر سارا موڑ خراب کر دیا۔“

”رشید،“ مصین بڑا بڑا ایسا۔ ”عجب بات ہے..... آدمی بھی ہے اور ابھی نہیں ہے۔“

ساجد نے مصین کو غور سے دیکھا۔ مصین جیسے کہیں اور ہو عجب بات ہے۔

”تم نے بتایا نہیں۔“

”ساجد بھائی،“ میں نے آکر اطلاع دی۔ ”آپ کے گھر سے فون آیا ہے کہ کتنی دیر میں واپس آ رہے ہیں۔“

”کہہ کر نہیں آئے تھے؟“ مصین نے پوچھا۔

”کہہ کر آیا تھا۔ مگر ہماری امی کو پریشان ہونے کی عادت ہے۔“

”میں نے انہیں بتا دیا۔“ میں بولا کہ ہم جیتنے کی خوشی منار ہے ہیں۔ ابھی پکھر چلے گی تو انہیں ذرا دیر ہو جائے گی۔“

”نمیں بھی آج نہیں۔“ فوراً انی اٹھ کھڑا ہوا ”پھر کسی دن۔“

مھین نے بھی اسے نہیں روکا۔ ”ہاں تھیک ہے۔ پھر کسی دن۔

ساجد رخصت ہو کر اپنے فلیٹ کی طرف چلا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر کری پڑھیر ہو گیا جسے دور سے چل کر آیا ہو۔ فوراً انی بھی آگئیں۔ ”آگئے اچھا کیا میں پریشان ہو رہی تھی۔ فون کیا تو ادھر سے میں بولا کہ ہم تو ابھی خوش منار ہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بیٹا کس بات کی خوشی منار ہے ہو۔ کہا کہ جنتنے کی خوشی۔ اے کون جیت گیا؟ میں نے پوچھا۔ کہا کہ پاکستان..... پاکستان اور بیٹے ہارا کون۔ اے لوٹلی فون ہی کٹ گیا۔ اچھا آرام کرو۔ میں چلی۔ چائے بھجواؤ۔“

”نمیں بھی کرا آیا ہوں۔“

باہر سے سیٹیوں کی آواز آئی۔ ”آج سیٹیاں بہت بچ رہی ہیں۔ تشویش بھر لے لہجے میں کہا اور چلی گئیں۔

امھر کر کرے میں ٹھیلنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کتابوں کو الٹا پلٹا۔ میز پر جو کتابیں بھری پڑی تھیں انہیں سلیقہ سے رکھا۔ فالتو کا غذاء پھاڑ کر روی کی ٹوکری میں ڈالے اس کے بعد سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ ایک مرتبہ پھر کہیں دور سے سیٹیوں کی آواز آئی۔ کمرے سے نکل کر بالکنی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ تیری منزل کے اس فلیٹ کی بالکونی سے یوں لگتا تھا کہ سارا شہر سامنے بچھا ہوا ہے۔ رات کے اوقات روشنیوں میں جگمگا تاکتنا خوب نظر آتا تھا۔ آج شکل تحوزی مختلف تھی۔ روشنیاں جہاں تھاں اور کچھ پھیکیں پھیکیں سوئی ہوئی میں نیچے اپنی سرک پر نظر ڈالی۔ کتنی مصروف سرک تھی اور اب سائیں سائیں کر رہی تھی۔ پھر پولیس سے بھری کئی جیپیں تیزی سے گزریں۔ خاموشی میں گھڑی بھر کے لئے خلل پڑا۔ پھر وہی ہو چکی۔ جنتنے کی خوشی میں نہ یہ کہا ہوا جملہ ایک بے نکلے پن سے بلاوجہ اس کے ذہن میں گونجا اور وہ اندر گیا۔ واپس کرے میں آ کر بالکونی میں کھلنے والا دروازہ اور سرک پر کھلنے والی کھڑکیاں بند کیں اور پھر جب اور کوئی مصروف فیٹ اپنے لئے پیدا نہ کر سکا تو کرسی پر دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔ کتنی نمل بے جوڑ با تیس اس کے تصور میں گھوم گئیں۔ ہم کس سمت میں ہیں اور کس سمت جا رہے ہیں۔ جنگل میں سمت کا احساس نہیں ہوتا۔ جنگل سا جنگل۔ خونخوار صورتوں والے نیزوں بھالوں سے مسلح گونڈ اور کالی رات۔ اب وہ نہیں آئے گا۔ واقعی؟ وہ چونکا اور ایک اضطراب میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چاہا کہ فوراً مھین کو فون کرے۔ اس وقت اس نے تھیک طرح سے بات ہی نہیں کی۔ پوچھنا تو چاہئے کہ ..... کہ ..... اور فوراً ہی دوسرا ہہر آئی۔ کیا پوچھتا ہے اور وہ پھر کری پر آہستہ سے بیٹھا اور آنکھیں موند لیں۔ پھر وہ گونڈوں کے جنگل میں تھا۔



## بندر کہانی

اصل میں یہ سارا واقعہ مہاتما بدھ کی ایک جاتک کथا سے شروع ہوا۔ یہ جاتک کथا اس طرح ہے کہ آدمیوں کی دنیا سے بہت دور ایک جنگل میں بندروں کی ایک برادری آپا تھی۔ ان میں سے کسی نے آدمی کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ اپنی کھال میں مست اور اپنے حال میں گمن پھرتے تھے۔ ان میں ایک بندر تھا جس نے زمانے کا گرم و سرد بہت دیکھا تھا اور جنگلوں میں بھی گھوما پھرا تھا۔ ایک مرتبہ اسے تحقیق کرنے کا خیال آیا کہ جنگلوں سے پرے کیا ہے۔ اس سفر میں اس کا گزر ایک ایسی بستی میں ہوا جس میں آدمی لنتے تھے۔ اس سفر سے وہ حیرت اور عبرت کا بہت سامان لے کر واپس ہوا۔ بندر اس کے گرد جمع ہوئے اور سفر کا احوال پوچھنے لگے۔ تب اس نے انہیں بتایا کہ اس نے اس سفر میں ایک زرالی مخلوق دیکھی ہے جو اپنے آپ کو آدمی کہتی ہے دمدار ذبال برائے نام و قدموں پر چلتی ہے۔ اس حلیہ والے کا حال احوال سایا تو انہوں نے کافیوں میں انگلیاں دے لیں۔ وہ انھوں کھڑے ہوئے یہ کہہ کر کہ اب اس جگہ ہم نہیں پیٹھیں گے کہ یہاں ہم نے بدی کی باتیں سنی ہیں اور کان پکڑے کہ آئندہ اس مخلوق کا کبھی نام نہیں لیں گے کہ وہ بد مخلوق ہے۔

جاتک کथا تو اس بات پر آکر ختم ہو گئی۔ مگر ختم نہیں ہوئی۔ بظاہر بندر اس قصے کو بھول برس گئے۔ لیکن شاید کہیں ان کے اندر ایک پھانس پڑ گئی تھی۔ ایک نوجوان بندر یہ قصہ سن کر کتنے دنوں بے چین پھرتا پھرا۔ آخر اس سے رہانے گیا۔ ایک روز وہ اس بندر کے پاس پہنچا جو آدمی کو جاننے اور پہچاننے کے بعد بندروں کے پیچ عاقل سمجھا جانے لگا تھا۔ پوچھا کہ ”اے عاقل، آدمی کس جنگل کا جانور ہے۔“

”جنگل کا جانور“ عاقل بندر پہسا اور بولا ”آدمی وہ وہ جانور ہے جو اپنے آپ کو جانوروں سے الگ سمجھتا ہے اور اپنے تین اشرف الخلوقات سا بنا ہوا ہے۔ جنگل سے اسے بیرون ہے۔ زمین پر آگے کتنے جنگل تھے۔ اس نے کتنے جنگلوں کا استھرا اور کر دیا۔ جنگل کا نتا ہے اور اینٹ پتھروں کی عمارتیں کھڑی کر کے ایک دیرانہ تیار کرتا ہے اور اس میں بس جاتا ہے۔“

”درخت کاٹ کر اینٹ پتھروں کی عمارتیں کھڑی کرتا ہے یہ تو عجب بات ہے۔“

”میاں بندرزادے بات یہ ہے کہ آدمی آسمان سے ڈرتا ہے اور ہوا سے لڑتا ہے۔ دیواریں کھڑی کر کے اور چھتیں پاٹ کر سمجھتا ہے کہ اس نے ان دو دشمنوں سے اپنی حفاظت کا سامان کر لیا ہے۔“

اس گنگلو نے جلتی پر تسل کا کام کیا۔ نوجوان بندر کو کرید تو پہلے ہی تھی کہ آخر یہ آدمی کس قسم کا جانور ہے۔ اب اور بڑھ گئی۔ اسی

کریڈ میں ایک رات پچھلے پھر جب سب بندر سور ہے تھے وہ چپکے سے اٹھا اور وہاں سے نکل لیا۔

نوجوان بندر کے تھوڑی کئی دن تک اسے ڈھونڈتے پھرے۔ جنگل کا ایک ایک کونہ چھان مارا۔ جب اس کا کوئی پتہ نہ پایا تو یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ ان کا دوست کسی درندے کے بھتے چڑھ گیا، اس نے اسے چیر پھاڑ دیا۔

دن گزرے، ہفتہ گزرے، مہینہ چڑھا۔ جن کے ساتھ وہ نوجوان درختوں پر کو دتا چھاندتا پھرا کرتا تھا اب وہ اسے بھول چلے تھے مگر ایک صبح وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نوجوان درخت درخت کو دتا چھاندتا چلا آ رہا ہے۔

نوجوان بندر نے جب یہ بتایا کہ وہ آدمیوں کی دنیا دیکھ کر آیا ہے تو وہ تو نقش حیرت بن گئے۔ پھر وہ اس کے گرد ایسے اکٹھے ہوئے جیسے وہ ولایت کی سیر کر کے آ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور ایک نئی دنیا کی دریافت کا سرور۔

”آدمی لوگ کیسے ہوتے ہیں؟“ ایک نو خیز بندر نے سوال کیا۔

”بہت کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔“

”میرا مطلب ہے کہ ہم بندر لوگوں سے کتنے مختلف ہوتے ہیں۔“ اس پر نوجوان بندر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا ”شروع میں تو میں یہ سمجھا تھا کہ یہ ہم سے بالکل مختلف مخلوق ہے۔ تو کتنے دن میں ان کے پیچے ایک اجنبی کی طرح دور دور گھومتا پھر تارہا۔ وہ آنگن میں تو میں منڈیر پر۔ اصل میں ان کی بستی میں درخت کم بہت ہی کم تھے منڈیریں زیادہ تھیں۔ تو میرا بسیرا زیادہ منڈروں پر ہوتا تھا۔ مگر جب میں نے انہیں دیکھا بھالا اور ان کے طور اطوار دیکھے تو اجنبیت دور ہوتی چل گئی۔ ایسا لگنے لگا کہ وہ اپنے ہی بھائی بندیں کہ دور پار آ کر بس گئے ہیں۔“

”مگر سناء کہ ان کے تو دمیں ہی نہیں ہوتیں۔ اس پر وہ سارے بندر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ نوجوان بندر نے متاثر سے اور کسی قدر معذرتی لہجہ میں کہا ”ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کے دم نہیں ہوتی۔ پہلے مجھے بھی یہ بات عجیب لگی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ لوگ عجیب جانور ہیں کہ اپنی دمیں ہی گم کر دیتے۔ جس کسی آدمی کو دیکھتا تو اس میں ایک کی کا احساس ہوتا مگر اب معاملہ الٹ ہے۔ تمہیں دیکھ رہا ہوں تو لوگ رہا ہے کہ ہمارے تمہارے ساتھ خواہ خواہ ایک فال تو چیز لگی ہوئی ہے۔“

اس آخری فقرے پر کچھ بندر سپٹائے۔ کچھ بندر برہم ہوئے۔ مگر پھر بات جلدی آئی گئی ہو گئی۔ نوجوان بندر نے ذکر ہی ایسا چھیڑ دیا تھا۔ کہنے لگا ”آدمی کی مادہ بہت خوبصورت ہوتی ہے۔“

”ہماری بندر یا سے زیادہ خوبصورت؟“ ایک نو خیز بندر نے سوال کیا۔

”ہماری بندر یا تو ان کے سامنے پانی بھرے۔“

ان بندروں کے لئے کہ خیر سے سب عالم شباب میں تھے بندر یاں پر یاں تھیں۔ انہیں اس بات کا کیسے تھیں آتا۔ ”آخر ماواؤں میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ ایک نے سوال کیا۔

”بس دیکھنے کی چیز ہے۔ گوری، چٹی، چکنی، چپڑی، زم گرم اور سینہ بس جیسے دو دھبھری دو کٹور یاں۔“ اور نوجوان بندر نے عورت کا سراپا کچھ اس رُلگینی سے بیان کیا کہ وہ سب مسحور ہو گئے۔

پھر نوجوان بندر نے بیان کرنا شروع کیا کہ آدمی نے کیسی کیسی چیز ایجاد کی ہے۔ کہنے لگا۔ ایک چیز تو اس نے ایسی ایجاد کی ہے کہ تم دیکھو گے تو عش عش کرائھو گے۔“

”وہ کیا چیز ہے؟“

”آئینہ۔“

”آئینے کیا؟“

کیا بنتا ہوں کہ آئینہ کیا چیز ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ آئینہ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ حیران کر میں آئینہ کے اندر کیسے چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ میں تو آئینہ کے باہر ہوں اور آئینہ میرے ہاتھ میں ہے۔ رفتہ رفتہ سمجھی سمجھی خلایہ کہ میں ایک نہیں ہوں۔ ایک کے اندر دو نہیں۔“

”کیا مطلب۔ ہم سمجھے نہیں۔“

”جب آئینہ دیکھو گے تو یہ بات سمجھی میں آئے گی۔ ہر بندر کے اندر دو بندر ہوتے ہیں مگر جب تک وہ آئینہ نہیں دیکھتا وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ ایک بندر ہے۔ تو میں نے آئینہ دیکھ کر یہ جانا کہ میں ایک نہیں ہوں دو ہوں۔ ایک آئینہ سے باہر ایک آئینہ کے اندر۔ نوجوان بندر کا پھر سوچتے ہوئے بولا کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اصلی بندر آئینہ کے اندر ہے۔ میں جو آئینہ سے باہر ہوں اس کی نقل ہوں۔“

آئینہ کی بات سن کر تو وہ سارے بندر بالکل ہی مبہوت ہو گئے۔ ایک نو خیز بندر کے سر میں مہم جوئی کا سودا سما یا جوش میں آکر اعلان کیا کہ میں آدمیوں کے دیس جاؤں گا اور آئینہ لے کر آؤں گا۔

جو ان بندرنے اسے ٹوکا۔ کہا کہ ”جو ان‘ آہستہ ہوں۔ ہمارے بڑوں کو پتہ چل گیا تو قیامت مجاہیں گے۔ انہیں کب گوارا ہے

کہ ہم اس جنگل سے نکلیں اور باہر کی دنیا کا تجربہ حاصل کریں۔“

جو ان بندروں کی تسمیہ نے اپنا اثر دکھایا۔ سب نوجوان اپنی اپنی جگہ محتاط ہو گئے۔ یوں ہوتا کہ رات کی تاریکی میں کوئی نوجوان بندرا لختا اور چپکے سے نکل جاتا۔ کتنے مہم جو نوجوان بندرا کی انداز سے اپنے جنگل سے نکلے اور آدمیوں کی دنیا کی خبر لائے۔ وہاں سے آئینہ ہی لے کر نہیں آئے اور کتنی ہی چیزیں لے کر آئے۔ ایک نوجوان بندرا کسی گھر سے ایک لہنگا اور ایک دوپٹہ اچک لایا۔ آکر اپنی بندر یا کو تجفہ میں پیش کیا۔ بندر یا نے حیرت سے لہنگے اور دوپٹے کو دیکھا اور پوچھا، یہ کیا ہے۔ نوجوان نے کہا، جنم پہنواوڑھوگی تو جانوگی کہ یہ کیا ہے بس پری بنا جاؤ گی۔“

بندر یا نے لہنگے کو اٹا پلٹا۔ جب اس کا الٹا سیدھا سمجھ میں نہ آیا تو دانتوں میں لے کر چیرتا شروع کر دیا۔ پورے لہنگے کو لیر لیر کر ڈالا۔ سہی عمل دوپٹے کے ساتھ کیا۔ نوجوان بندر نے اپنے دیئے ہوئے تجفہ کا یہ حال دیکھا تو آگ بگولا ہو گیا۔ ڈنڈے سے اسے خوب پیٹا اور گھر سے نکال دیا۔

ابھی بندروں میں اس واقعہ پر چمگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ایک بندر یا اغوا ہو گئی۔ پھر یوں ہوا کہ ایک بندر نے اپنی بندر یا سے من موز اور کسی غیر بندر یا سے ناجائز تعلقات قائم کرنے۔ جب اس کی بندر یا نے اس پر شور مچایا تو بندر نے اسے طلاق کی دھمکی دے دی۔ بندر طلاق کے لفظ پر بہت چکرائے۔ یہ لفظ پہلی مرتبہ ان کے کان میں پڑا تھا۔ وہ اس کے معنی پوچھنے کے لئے عاقل بندر کے پاس پہنچا۔

عاقل بندر کا اب زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا تھا۔ بات یہ تھی کہ جب اس کا آدمیوں کی بستی میں گزر ہوا تھا تو اسے وہاں سے سب سے عجیب چیز جو نظر آئی وہ کتاب تھی۔ ایک دفعہ وہ کتابوں کی ایک دکان میں گھس گیا۔ کتابیں پھاڑتے چھاڑتے اس نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی ان کے اندر کیا ہے۔ حیران ہوا کہ اچھا اس بے عقل خلوق نے ایسی عقل کی باتیں مجھی لکھ رکھی ہیں۔ اس نے ایک موٹی سی کتاب انھائی اور اسے وہاں سے لے بجا گا۔ اب وہ دن رات اپنی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہتا تھا۔ اس کتاب میں وہ ایسا گم ہوا کہ اسے یہ پتہ ہی نہ چلا کہ بندروں کی دنیا میں کیا اندر ہیر مچا ہوا ہے۔ طلاق کا لفظ سن کر اس کا ماتھاٹھنا کا طلاق؟ اس فعل کا بندروں سے کیا اعلق۔ یہ توحضرت انسان کی ایجاد ہے۔ انہوں نے ہی یہ لفظ گھرا ہے۔ تم نے کہاں سے سن۔

بندروں نے جب اس عاقل کو بتایا کہ ایک بندر نے اپنی بندر یا کو طلاق کی دھمکی دی ہے اور اس کے ساتھ اغوا اور ناجائز تعلقات کی اور ایک بندر یا کے لہنگا نہ پہننے اور اس کی پاداش میں اپنے بندر کے ہاتھوں اپنے گھر سے نکالے جانے کے قصے قصے سنائے تو اس

عقل نے تو اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ یہ تم مجھے کیا سنارہ ہے ہو۔ یہ تو سب آدمیوں کے لچھن ہیں۔ بندروں کے اخلاق میں یہ فساد کیسے پیدا ہوا۔ کیا کوئی آدمی ہمارے جنگل میں گھس آیا ہے اور بندروں کے اخلاق کو خراب کر رہا ہے یا کوئی بندرا آدمیوں کے دلیں کا پھیرالا گا آیا ہے کہ خود تو گمراہ ہوا تھا ب دوسرے بندروں کو گمراہ کر رہا ہے۔“

بندروں نے کہا کہ ”اے عاقل، آدمی کی کیا مجال کہ ہمارے جنگل میں قدم رکھے۔ کوئی آوارہ بندرا اگر آدمیوں کے دلیں کا چوری چھپے پھیرالا گا آیا ہے تو ہم کہہ نہیں سکتے۔“

بہت سوچ بچار کے بعد ایک بندر سمجھا منعقد کی گئی۔ عاقل بندر مند صدارت پر بیٹھا اور بندروں سے یوں مخاطب ہوا کہ اے میرے ہم جنسو عزیز بندروں میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ بندروں کے اخلاق خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے یہ سن گئی ملی ہے کہ چند سر پھرے نوجوان بندر خوش آوارگی میں آدمیوں کے دلیں میں جائیں گے۔ اب واپس آئے ہیں تو ان کے اندر آدمیوں کی بو بھری ہوئی ہے۔ اپنی تہذیب سے نالاں ہیں۔ بدیشی تہذیب کے حرمیں ہیں۔ بے حیائی اور بے غیرتی کی حد ہو گئی کہ ایک بندر نے اس تہذیب سے مانگے تائیں کا لباس اپنی گھروالی کو پہنانے کی کوشش کی۔ اور جب اس غیرت والی نے اور حیا کی پتلی نے وہ بے شرمی کا لباس پہننے سے انکار کیا تو اس نگ خاندان نگ قوم نے گھروالی کو زد و کوب کیا اور گھر سے نکال دیا۔ مگر کس گھر سے۔ اس گھر کی حقیقت میں آگے بیان کروں گا۔ اے بندرو اب جو میں کہتا ہوں اسے گوش ہوش سے سنو۔ ہم بندروگوں کا اپنا ایک تمدن اپنا ایک کلپھر ہے اس تمدن اس کلپھر کی اپنی ایک تاریخ ہے ہم بندروگ فطرت کی گود میں پلے ہیں۔ موسموں نے ہمیں لوریاں دی ہیں۔ درختوں نے ہمیں جھولا جھلا یا ہے۔ ہواوس نے ہمیں تھپک تھپک کر سلا یا ہے اور گدگدیاں کر کے جگایا ہے۔ ہم نے اپنے تحفظ کے لئے گرمی سردی سے آندھی برسات سے بچنے کے لئے آرام و آسائش کے لئے ذائقے اور مزے کے لئے کبھی کوئی مصنوعی طریقہ اختیار نہیں کیا۔ جیسا قدرت نے ہمیں بنایا ویسے ہم پہلے بھی تھے۔ آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہتا چاہتے ہیں۔ اپنے بال ہمیں برے نہیں لگتے اور اپنے بدن سے ہم خائف نہیں۔ یہ بال ہی ہمارا فطری لباس ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم نیچے نہیں ہیں۔ اس لئے اپنے بدن سے ہمیں جا ب نہیں آتا اور مصنوعی کپڑے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ادھر عالم یہ ہے کہ کچھ بال ان کے اعمال کی وجہ سے اڑ گئے۔ باقی جورہ گئے ہیں وہ انہیں استرے سے مونڈھ ڈالتے ہیں۔ اب تم پوچھو گے کہ یہ استرا کیا ہے۔ اے عزیزو میں ڈرتا ہوں اس دن سے جب کسی بندر کے ہاتھ میں استرا آجائے۔ وہ ہمارے تمدن کا آخری دن ہو گا۔

”ویسے تو اس تم ایجادا و انسان نے کیا کچھ ایجاد نہیں کیا۔ مگر اس کی سب سے زیادہ مہلک ایجادات دو ہیں، آئینہ اور استرا۔ عزیز

بندرو کیا تم یقین کر دے گے کہ جب میں نے پہلی مرتبہ آئینہ دیکھا تو میں سکتے میں آگیا۔ مجھے عجب گمان ہوا کہ یہ حقیر فقیر بندرو جو آئینہ کے رو برو بیٹھا ہے محض ایک واہم ہے۔ اصل بندرو ہے جو آئینہ کے اندر سے مجھے تک رہا ہے۔ مگر میں نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ منڈیر پر بیٹھ کر اس آئینہ کو لکڑے لکڑے کیا اور اسی آنکھ میں پھینک دیا جس آنکھ سے اسے اچکا تھا۔ دل میں کہا کہ اپنی ذات میں شک کرنا اور پر چھائیوں کے پیچھے دوڑنا تو آدمی کا شیوه ہے۔ اس کی کھوپڑی میں قدرت نے ایک ایسی چیز رکھ دی ہے کہ اس میں طرح طرح کے وہم پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہم بندروں اپنی الگ کھوپڑی لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کھوپڑی اوہام و افکار کو رہ نہیں دیتی۔ بندرنہ فلسفی ہوتا ہے نہ صوفی۔ بندر بس بندر ہوتا ہے۔ میں کہ ایک بندر ہوں اپنی کھڑی دم اور بالوں سے ڈھکی کھال کے ساتھ ایک زندہ حقیقت ہوں۔ اس جنگل کی سب سے بڑی سچائی۔ آئینہ جھوٹا ہے۔ آدمی نے دیے تو بہت سے جھوٹ گھرے ہیں۔ مگر یہ سب سے نرالا جھوٹ ہے۔ دیے میں استرے سے زیادہ خوفزدہ ہوں۔ چھری، چاقو، کلہاڑی، تکوار یہ سب استرے ہی کی اولاد ہیں آدمی نے پہلے استرا بیجا دیا۔ اس سے اس نے اپنا سر موٹا۔ پھر کلہاڑی بنائی جس سے درخت کاٹے۔ پھر تکوار بنائی جس سے اس نے اپنے بھائیوں کے گلے کاٹے۔ آدمی کے ہاتھ میں استرا آیا تو اس نے یہ کیا۔ بندر کے ہاتھ میں استرا آئے گا تو وہ کیا کچھ نہیں کرے گا۔ اسے بندرو خدا سے ڈرو اور آدمی کے اثر سے پچھوڑنہ یاد رکھو کہ ایک دن وہ آئے گا کہ تمہاری دمیں غائب ہو جائیں گی اور تم دونا انگوں پر چلو گے۔

اس آخری فقرے پر تو سارے بندر سچ مجھ کانپ اٹھے مگر ایک بندرزادہ یوں بولا کہ دم میں کیا رکھا ہے۔ غائب ہو جائے تو اچھا ہے۔ ہمارے دم کے ساتھ جو یہ دم چھلا لگا ہوا ہے اس سے نجات ملے گی۔

یہ بات سن کر تو بندر آگ بگوا ہو گئے۔ اور اس نو خیز بندر کو پھاڑ کھانے کو دوڑے۔ عاقل بندر نے انہیں سمجھایا کہ غصے میں بندروں کو اتنا پاگل نہیں ہونا چاہئے کہ بالکل آدم زادہ بن جائیں اور ہم جنسوں کو کھھوڑ کھائیں۔ یہ بندر کا بچ نادان ہے، کچھ فہم ہے۔ دم سے محروم مخلوق کے بارے میں کسی سے سن لیا ہے، سوالی بات کرتا ہے۔ ورنہ دم کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جوانا کر کر دہ کافر ہے۔ بندر کی بندریت تو اس کی دم سے ہے۔ جو دم نہیں رکھتا وہ کہاں کا بندر ہوا۔

بندروں کا غصہ مشکل سے ٹھنڈا ہوا۔ مشکل سے اپنی جان بچا کر وہ نو خیز وہاں سے نکلا لیکن اس واقعہ کے اثرات دور رہ ہوئے۔ دم اب تک ایک مسلم حقیقت تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ ایک اختلافی مسئلہ بن گئی۔ نوجوان طبقہ میں یہ خیال عام ہوتا چلا گیا کہ دم بندروں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اکثر یوں استدلال کرتے تھے کہ آدمی نے محض دم نہ ہونے کی وجہ سے اتنی ترقی کر لی ہے کہ

آسمانوں میں اڑتا اور پاہاں کی خبر لاتا ہے ورنہ اس میں اور کون سی ایسی صفت ہے جو بندروں میں نہیں۔ جیسے بندروں یے آدمی بس دم سے نجات پا کر وہ بندروں سے آگے نکل گئے۔ مگر پرانی وضع کے بندر یہ کہتے تھے کہ بندر کی بندریت ہی دم میں پوشیدہ ہے۔ دم غائب ہو جائے تو بندرا اور آدمی میں فرق کیا رہ جائے گا۔ سو اپنی تہذیبی اور قومی شاخت کی خاطر دم کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ یوں بندر نظریاتی طور پر دو گروپوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ نوجوان ترقی پسند بندر جو دم کو ترقی کی راہ میں حائل جانتے تھے اور دم بریدگی کے مبلغ تھے۔ اور ایک وہ قدامت پسند بندر جو دم کے علمبردار تھے۔

دم وہمن نوجوان طبقہ کے خلاف بہت دشام طراز یاں ہوئیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ یہ گمراہ نوجوان بندروں کی اخلاقی قدروں ہی کو نہیں مانتے اور جنسی کبحروں کا عکار ہیں۔ اصل میں نئے خیالات طبقہ نواداں میں بھی تیزی سے پھیل رہے تھے جسی آزادی ان نئے خیالات کا شاخانہ تھی۔ پرانی وضع کے بندر یہ سوچ کر پریشان تھے کہ یہ محب اخلاق انسانی خیالات بندر سماج کو ایک اخلاقی بحران سے دوچار کر دیں گے۔ مگر نئے خیالات پر اب بندوں میں باندھا جا سکتا تھا۔ نئی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں۔ نئے رجحانات پرورش پار ہے تھے۔ اسی ہنگامہ تحریک تقلید شروع ہو گئی مقلد غیر مقلد کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ تقلید پرستوں کا موقف یہ تھا کہ بندروں کی اپنی قدر میں فرسودہ ہو چکی ہیں کہ نئے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ اب انہیں آگے بڑھنے کے لئے آدمیوں کی تقلید کرنی چاہئے غیر مقلد کہتے ہیں کہ

### تقلید کی روشن سے تو بہتر ہے خود کشی

تقلید بندروں کو آدمی کا نقال بنا کر رکھ دے گی اور آدمی کی نقالی سے بندروں کی کیا گلت بنتی ہے اس سلسلہ میں وہ ایک حکایت سناتے تھے جوانہوں نے عاقل بندر سے سنی تھی۔ ایک بندر نے کسی بڑھتی کو دیکھا کہ ایک موٹے سے لکڑ پر بیٹھا ہے اور اسے اس طرح پھاڑتا ہے کہ دو میخیں ہاتھ میں ہیں۔ ایک میخ کو لکڑی کے شگاف میں رکھ کر ٹھونکتا ہے۔ جب شگاف زیادہ چوڑا ہو جاتا ہے تو اس میخ کو نکالتا ہے اور دوسرا میخ ٹھونک کر لکڑ کو پھاڑنے لگتا ہے۔ بڑھتی یہ کام نیچ میں چھوڑ کر کسی اور کام کو چلا گیا۔ بندر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بڑھتی کی طرح لکڑ پر بیٹھا اور میخیں ٹھونک کر اسے پھاڑنے لگا مگر وہ ایسے انگھڑ طریقہ سے لکڑ پر بیٹھا تھا کہ اس کے ہیضے شگاف میں پھنس گئے۔ ایک میخ کو نکال کر دوسرا میخ ٹھونکنا چاہتا تھا مگر تھوڑا سا چونک گیا۔ ایک میخ تو نکال لی۔ دوسرا میخ ٹھونکنے میں دیر کر دی۔ ترت لکڑی دونوں طرف سے مل گئی اور ہیضے اس کے پیچی ہو گئے۔ تب بندروں سے چلا یا اور کہنے لگا کہ کمخت آدمی کے کام آدمی ہی کو ساجھتے ہیں جو بندراں کی نقالی کرے گا اس کا حال میرے جیسا ہو گا۔

مگر تقلید کے مخالفوں کی ساری دلیلیں بے اثر ثابت ہو گیں۔ تقلید پرست تقلید کی روشن پر اڑے رہے۔ اور ایک دن ایک عجیب واقعہ گزرا۔ بندروں نے ایک نوجوان بندر کو دیکھا کہ اس کی دم غائب ہے۔ بندروں نے اس دم کئے نوجوان بندر کو دیکھا اور جیران ہوئے مگر ایک بندر یا اس کی دم کٹی دیکھ کر اس پر ایسی فریقہ ہوئی کہ اپنے بندر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہوئی۔

عقل بندر کو جب اس واقعہ کا پتہ چلا تو اس نے ماتھا پیٹ لیا اور کہا کہ میں اسی دن سے ڈرتا تھا۔ ناعقبت اندریش بندروں کے ہاتھوں میں استرا آگیا ہے۔ پہلے وہ اپنی دمیں کاٹیں گے پھر ایک دوسرے کے گلے کاٹیں گے۔

بندروں کے اس عبرتاک انعام کا تصور کر کے عاقل بندر رہا۔ پھر بندروں کے بیچ سے انٹھ کر دوڑا یک پہاڑ جا بیٹھا اس طرح کہ اس نے ہونتوں کوی لیا تھا، آنکھیں مومندی تھیں اور کانوں میں انگلیاں ٹھوٹیں لی تھیں۔



# طو طے مینا کی کہانی

طو طے مینا کی بحث لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ روز رات کو وہی قصہ کھرا ہو جاتا تھا کہ مرد بذات ہے یا عورت بد نہاد ہے۔ طو طا کہانی سناتا کہ عورت نے کیا مکر کیا غریب مرد کو کس طرح خراب کیا۔ جواب میں مینا ایک کہانی داشت دیتی۔ مضمون یہ ہوتا کہ مرد بے وفا، سگدل اور فرمی ہے۔ عورت نیک پارسا ہے، بھولی بھالی ہے، مرد کی ستائی ہوئی ہے۔

طو طے مینا کی جو کہانی مشہور ہے اس میں تو یہی قصہ چلتا ہے مگر اصل میں وہاں ایک قصہ اور کھڑا ہو گیا تھا جس درخت پر طو طا مینا بیٹھے یہ بحث کیا کرتے تھے اس درخت پر اور پرندے بھی بسیرا کرتے تھے۔ وہ سب اس بحث سے ٹلک تھے۔ دن بھر کے تھکے ہارے شام پڑے اس درخت کی مختلف شاخوں پر آ کر براتتے۔ بعضوں نے گھونسلے بنار کئے تھے۔ بعض بھنپ پر بسیرا کرتے۔ آگے کتنے آرام سے رات بسر کرتے کہ اندھیرا ہوا اور سب اپنی اپنی جگہ چپ جو ہے اپنی جگہ چوچ بند کئے آنکھیں موندے بیٹھا ہے مگر جب سے اس طو طے اور مینا نے اس پیڑ پر اپنا ٹھکانہ بنایا تھا تب سے ان کی راتوں کا سکون نااب ہو گیا تھا۔ سب پرندے بیکل تھے۔

ایسی درخت پر ایک پودنے اور پودنی کا بھی بسیرا تھا۔ پودنی طو طے مینا کی اس بحث پر کچھ زیادہ ہی ناخوش تھی۔ ایک رات چڑک پودنے سے کہنے لگی ”ان طو طے مینا پر خدا کی ما را نہوں نے کیا کئے کامغز کھایا ہے کہ رات بھر بھوکتے رہتے ہیں۔“

پودنے نے بے انتہائی سے کہا کہ ”ایک دوسرے کامغز چاٹتے ہیں ہمارا کیا لیتے ہیں۔“

”یتم نے اچھا کہا کہ ہمارا کیا لیتے ہیں۔ انہوں نے تو ہمارا چمیں آرام لے لیا۔ آخر یہ مرد عورت ہیں کون جناور کے ان کا مقدمہ طے ہونے میں نہیں آرہا۔“

”نیک بخت تو مرد عورت کو نہیں جانتی۔ آدم زاد ایک مخلوق ہے جس نے اپنے زکو مرد کا اور ما دہ کو عورت کا نام دے رکھا ہے۔“

”مگر اس غیر مخلوق سے طو طے مینا کا کیا رشتہ ہے۔“

پودنے نے زہر خد کیا اور کہا کہ ”بہت گہر ارشتہ ہے۔ یہ دونوں اس مخلوق کی قید میں رہے ہیں اور اس مخلوق نے یوں تو طرح طرح کی ایجادات کی ہیں مگر اس کی سب سے انوکھی ایجادوں ہے جسے پتھرہ کہتے ہیں۔ میری جان پتھرہ بھج بیز ہے۔ جو ایک مرتبہ پتھرے

میں چلا گیا وہ بھرے سے نکل بھی آئے تو بھرے ہی میں رہتا ہے تو سمجھو کہ یہ دونوں ابھی تک بھرے میں ہیں۔ آدمی کا بھوت ان پر سوار ہے۔ اس کا راگ الائچے رہتے ہیں۔“

”بھر آدمیوں ہی میں جا کے میریں۔“ پودنی نے جلا کر کہا ”ہماری نیندیں کیوں خراب کرتے ہیں۔“

”نیک بخت وہ یہاں کہاں ہیں۔ ان کا دم وہیں اٹکا ہوا ہے۔ جب سے آئے ہیں مجال ہے کہ انہوں نے ہم پر طاری انہوں نے نظر بھی ڈالی ہو۔ آدمزاد کے اگلے پچھلے اصلی فرضی قصے بیان کر کر کے کٹ جھیتی کرتے رہتے ہیں یہ کٹ جھیت بھی تو مغلوق کا وظیر ہے۔ ہم پرندے کٹ جھیت کیا جائیں۔ بحث و مباحثہ مارا شیوہ نہیں۔ ہم تو بس چچھاتے ہیں۔“

پودنی نے قصے کو مختصر کیا اور کہا ”میرے سر تاج، مرا گذار اُن نجاست ماروں کے ساتھ نہیں ہوگا۔ میری تو صحت کو گھن لگ گیا۔ نیند جو نہیں آتی۔ ان کا کوئی بندوبست کرو یا تو وہ چونچ بندر کھیں یا پھر یاں سے لمبے نہیں۔ اور پیڑ بھی تو ہیں جا کر نہیں میں کریں۔“

پودنے کو اب واقعی سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ بہت سوچ کر ایک دم سے پھر یہی لی۔ کہا کہ ”جا کر ان سے بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر پھر سے اڑ طو طے مینا والی شاخ پہ جا اترा۔ اس وقت مینا کہانی سن رہی تھی۔ اسے پودنے کا یوں بیچ میں آن و ہمکنا اچھا نہیں لگا۔ بولی ”بھائی پودنے، اس رات گئے کیا آفت آن پڑی کہ بے آرام ہوئے اور یہاں آئے۔“

”اری بھینا مینا، آرام اب کہاں۔ تمہاری عورت مرد کی رام کہانی عجب ہے ہماری تو رات کی نیند غائب ہو گئی۔ یہ عورت مرد کا مقدمہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔“

”ہاں لمبا تو ہو گیا۔“ طوطا بولا ”جب سے اماں حوانے بیچارے باوا آدم کو پھسلا کر گندم کا دانہ کھلایا ہے اس وقت سے چل رہا ہے۔ اور جوں جوں وقت گزر رہا ہے اس میں بیچ پڑتے چلے جا رہے ہیں خیر میں نے تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا تھا۔ مگر مینا نے ضد کپڑا ہے مانتی ہی نہیں۔“

مینا نے ترت جواب دیا ”میں نہ مانوں والی روشن تومنے اپنائی ہوئی ہے۔ میں نے مرد کے سارے عیب بکھان ڈالے۔ کون سا عیب ہے جو مرد میں نہیں ہے۔ مگر مرد نے جو تمہیں ایک سبق رٹا دیا ہے وہی دھرائے چلے جا رہے ہو کہ مرد کی ذات بے عیب ہے۔ عورت عیبوں کی پوٹ ہے۔“

”نیک بخت تو تم دونوں اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو۔ ایسے تو یہ معاملہ نہیں بنئے گا۔“

پودنایا کہتا تھا کہ مورا پنی شاخ سے اڑا اور ان کے برابر آن بیٹھا۔ پودنے کی بات اس نے سن لی تھی۔ اس سے اسے شہ می۔ کہنے

لگا۔ ”صاحبہ صاف بات ہے۔ طوٹے مینا کی بحث دکھرا رہیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ میری مورنی ساری رات بے آرام رہتی ہے۔ صح اٹھتی ہے تو مزاج چڑچڑا ہوتا ہے تو اس قصے سے ہماری گھر میں ایک پریشانی آگئی ہے میں پوچھتا ہوں کہ ڈھنڈ و عورت اور ٹوٹ مرد کا قصہ کب تک چلے گا۔“

مورنی نے اپنے مور کو بڑھی سے بولتے سنا تو اس نے بھی پر پھر پھرائے اور ان کے پیچ میں آن اتری۔ اس نے ایک اور سوال کھڑا کر دیا۔ ”میں یہ پوچھوں ہوں کہ یہ دونوں پیشگی ہیں کون، کہاں سے آئے ہیں۔ آپس میں ان کا تعلق کیا ہے کہ چونچ سے چونچ ملا کر باشیں کرتے رہتے ہیں۔

”طوطا اور جنس میں اور جنس۔ پھر یا تن شیر و شکر کیسے ہو گئے کہ رات رات بھر کھسر پھر کرتے رہتے ہیں۔“

مورنی کی اس بات پر چکوی کے کان کھڑے ہوئے جو برابر والے درخت پر پیشگی تھی۔ اس نے چکوے کو شہو کا۔ ”اے میں نے کہا کہ تم تو اسی درخت پر نیٹھے ہو۔ وہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“

”طوطا میں نے آدم زاد کا قصہ شروع کر رکھا تھا۔ اس سے ایک فساد انھوں کھڑا ہوا ہے۔ ہوتا ہی تھا جہاں آدم زاد وہاں فساد۔“  
”مگر مورنی کیا کہہ رہی ہے۔“

”مورنی تو بے پر کی اڑاتی رہتی ہے۔“

”مگر متنا تو چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔“

سوچکوا چکوی بھی اڑ کر وہاں جا پہنے۔ چکوی نے مورنی کی بات پر گرد لگائی۔ ”جیا بھی کوئی چیز ہے۔ ہم چکوا چکوی خیر سے میاں بیوی ہیں لیکن کبھی ایک شاخ پر اکٹھے بسیر نہیں کیا۔ میں ایک درخت پر تو چکوا دوسرا درخت پر۔“

پودنی بھی آن پیشگی اور چکوی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ پودنا حلقہ نہ تھا۔ دیکھا کہ مادا ہمیں تو اس قصے کو کچھ اور ہی رنگ دینے پر تمنی ہوئی ہیں۔ اس نے ان کی باتوں کو کاٹا اور بولا ”میرے خیال میں فساد کی جزاً آدم زاد کا قصہ ہے۔ اس قصے کو ختم ہونا چاہئے نہیں تو نئے نئے قصے شروع ہو جائیں گے اور ہم پرندوں کی دنیا کا امن و سکون بالکل بر باد ہو جائے گا۔“

چکوے نے تائید میں سر ہلایا ”ٹھیک کہتے ہو میاں پوچھنے۔ ہماری عافیت اسی میں ہے کہ آدم زاد کا یہ قصہ کسی طرح سے ختم ہو۔“  
پودنے کو چکوے کی حمایت سے شملی۔ اس نے اب زیادہ کھل کر طوٹے میانا سے بات کی۔ ”یہی بختو، تم دونوں اپنی اپنی بات پر اڑئے ہوئے ہو۔ ایسے تو یہ قصہ ختم نہیں ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ کسی منصف مزاج کو پیچ میں ڈالو۔ وہ تمہارے درمیان منصفی کرے اور

مقدمے کا فیصلہ سنائے۔“

”اچھی تجویز ہے۔“ طوطا بولا ”مگر منصف مزانج یہاں کون ہے جس سے فیصلہ کرائیں۔“

”مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔“ پودنا بولا ”کتم دونوں نے پنجروں میں زندگی گزاری ہے اور بس آدم زادو کو دیکھا ہے اس لئے تمہیں کوئی منصف مزانج نظر نہیں آتا۔ پرندوں کو تم نے کہا برتا ہے۔“

”اچھا تو پھر بتاؤ کہ کس کو منصف بنائیں۔“

پودنا مور اور چکوے سے مخاطب ہوا ”کیا خیال ہے کے منصف بنائیں۔“

مورشش و پنچ میں پڑ گیا۔ مگر چکوے نے سوچ کر مناسب تجویز پیش کی۔ کہا ”اس جنگل میں دانا بینا تو ایک ہی ہے۔ وہ الو ہے۔ سب سے الگ تھلک بیٹھا ہے۔ نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں۔ بس گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔“

”بالکل صحیک۔“ پودنے نے کہا ”ہمیں الو کی خدمت با برکت میں چل کر اس سے انجا کرنی چاہئے کہ اس مقدمے کے حق انصاف کرو اور اسے نہیں۔ کہو بینا بی اور طوٹے میاں تمہیں یہ تجویز منظور ہے۔“

طوٹے اور بینا دونوں کی براہمی اور خاص طور پر ماداؤں نے جو شگوفہ چھوڑا تھا اسے دیکھتے ہوئے خیریت اسی میں دیکھی کہ یہ تجویز مان لی جائے۔

سو سب پرندے اڑے۔ پودنا آگے آگے باقی سب پیچھے پیچھے۔ جنگل کے اس اجاڑ گوشے میں پہنچ جہاں سب سے الگ ایک لند منڈ پیڑ کے ایک ترے مڑے تھنھے پر الوا کیلا آنکھیں موندے اونگھر رہا تھا۔ پردوں کی پیڑ پھڑاہٹ سن کر ایک الکاہٹ کے ساتھ آنکھیں کھولیں، پرندوں کے غول کو دیکھا اور خشک لبجہ میں بے وقت آنے کی وجہ پوچھی۔

پودنے نے ادب سے گزارش کی۔ ”اے دانا بینا طاڑا ہم پرندے معانی چاہتے ہیں کہ ہم تیری خلوت میں محمل ہوئے۔ مگر کیا کرتے ہم ایک الجھن میں پھنس گئے ہیں۔ طوٹے بینا کے درمیان ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے۔ جس نے ہمارے سکون کو بر باد کر دیا ہے۔ اے بزرگ طاڑ تو دانا ہے اور منصف مزانج، اس مقدمے کے حق فیصلہ کر کہ اس جھگڑے سے ہمیں نجات ملے۔“

”عزیز پرندو وہ جھگڑا کیا ہے۔“

”جھگڑا یہ ہے کہ وہ جو آدمی نام کی مخلوق ہے اس میں نیک کون ہے بد کون ہے۔ مرد یا عورت۔ بینا عورت کو نیک پارسا اور مرد کو بد بتاتی ہے۔ طوطا مرد کو نیک و پاک اور عورت کو بد بتاتا ہے۔“

آدمی کا نام سن کر الوکے مزاج میں برہمی پیدا ہوئی۔ تلخ الجہ میں بولا ”اے طاران خوش الحان تم کس مخلوق کا مسئلہ لے کر میرے پاس آئے ہو۔ عورت اور مرد میں سے اچھا کے کہا جائے عورت آفت کی پڑیا، مرد پور پور میں فنڈاں لئے کہ دونوں آدمی کی ذات ہیں۔ اور آدمی بد ذات ہے۔ بد ذات سا بد ذات بزر قدم خود ہے، منہوس مجھے بتاتا ہے۔ خود بستیاں اجاڑتا ہے، نام میرا بدنام کرتا ہے۔ اس کا یہ طور دیکھ کر جی اپنا سرد ہوا، صحبوں سے نفور ہوا، عزلت نشینی کو شعار کیا۔ دن کی روشنی ہی سے بیزاری ہو گئی کہ اس روشنی میں خواہ مخواہ اس بد ذات کی صورت دیکھنی پڑتی تھی۔ رات کا اندر چیرا اور سنا بھی کو خوش آیا۔ مگر اس مخلوق نے ایسی کارستانی کی کہ اب راتوں کی پا کیزگی بھی جاتی رہی۔ اب صورت یہ ہے کہ دن میں آدم زاد کا شور و غل، رات کو اس کی بنائی ہوئی مشینوں کا شور اور بجلی کی روشنی۔ ہم عزلت نشین کہاں جا کر منہ چھپا گئیں۔ ہر جگہ اس بزر قدم کے قدم پہنچے ہوئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ لٹی پٹی ادھ موئی مرغابیوں کا ایک قافلہ ہانپتا کانپتا قائم کرتا اپنے اس دیرانے میں آ کر پناہ کا طالب ہوا۔ میں جیران و پریشان کہ کس دلیس کی مخلوق اور کہاں آ کر پناہ مانگ رہی ہے۔ میں نے کہا کہ اے طاران عزیز تم پر کیا افتاب پڑی کہ تم نے اپنے محنتدی لہرس لیتی آبی اقلیم کو چھوڑا اور یہاں اس دیرانے میں اس حال سے آئے ہو کہ جیسے کسی نے تم سے ترپنے پھر کرنے کی توفیق ہی سلب کر لی ہو۔ انہوں نے محنت انس بھر کر کہا کہ کیسی آبی اقلیم اب وہاں پڑوں امنڈ رہا ہے۔ آدم زاد نے اپنے آپس کے جھگڑے میں ہمارے سمندر کی پاکیزگی کو غارت کر دیا۔ مت پوچھو کہ ان پانیوں میں کیا کیا زہر گھول گایا ہے۔ میں سنائے میں آگیا کہ اس بد ذات نے ہوا میں تو پہلے ہی کٹافت گھول دی تھی، اب سمندروں میں بھی زہر گھول دیا۔ میں نے محنت انس بھر اور آسمان کی طرف دیکھا مگر آسمان پر الگ ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔ فھادھواں دھار پرندے مضطرب جیسے کسی بڑی آندھی نے انہیں آلیا ہو۔“

الوکا یہ کلام سن کر سب پرندے سکتے میں آگئے۔ پودنا تشویش کے ساتھ بولا ”اے دانا اس نقشہ میں تو مجھے سب پرندوں کی تباہی کا سامان نظر آ رہا ہے۔ آدمی ہمارا کیوں دشمن بنتا ہوا ہے۔“

”وہ خود اپنا بھی دشمن بنتا ہوا ہے۔ اس میں اس کی اپنی تباہی کا بھی تو سامان ہے۔“

”پھر تو آدمی کو سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔“

اس پر چکوئے نے نکلا گایا ”اس کے پاس عقل ہو تو سوچ۔“

الوں نے چکوئے کی آدم شناسی کو سراہا اور افسوس کے ساتھ کہا ”کنجت کے پاس ذہن ہے مگر عقل نہیں ہے۔“

”آدمی کو عقل کب آئے گی۔“ پودنے نے سوال کیا۔

”پوڈنے تو نہ مشکل سوال کیا ہے۔“ الو بولا اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔“

”پھر کس کے پاس ہے؟“

الونے لمبا تامل کیا۔ پھر بولا ”یہاں سے دور جمالیہ کی تلہٹی میں ایک گھنا جنگل ہے۔ وہاں پہل کا ایک بلند والہ درخت ہے اس کی پھنگ پر ایک کوا بیٹھا ہے۔ جنگل کے پرندے اسے کامنی کہتے ہیں۔ اس کے پاس تیرے سوال کا جواب ہوتا ہے۔“

پوڈنے نے ساتھی پرندوں سے کہا کہ ”ساتھیوں کا گامنی کے پاس چلو کہ ہم اس سے اپنے سوال کا جواب لیں۔“

تو پھر پوڈنا آگئے باقی پرندے پیچھے پیچھے۔ یوں یہ قافلہ ہمال کی تلہٹی کی طرف چلا۔ راستے میں ایک تیز ملا۔ اس نے پوچھا ”اے دوستو کدھر کی اڑان ہے۔“

پوڈنے جواب دیا ”ہم کا گامنی سے یہ پوچھنے جا رہے ہیں کہ آدمی کو عقل کب آئے گی تو بھی ساتھ چاہے تو چل۔“

تیز نے ایک قہقهہ لگایا ”آدمی اور عقل، بجان تیری قدرت۔“ پھر اس نے پر پھر پھر ائے اور اڑ گیا، مستقل ہنستا ہوا اور شور مچاتا ہوا۔ ”آدمی اور عقل، بجان تیری قدرت آدمی اور عقل بجان تیری قدرت۔“

ہر ج مر جنپیچتا یہ قافلہ ہمال کی تلہٹی میں پھیلے ہوئے گھنے جنگل میں پہنچا۔ دیکھا کہ درختوں کے پیچے ایک بلند والہ پہل ہے جس کی پھنگ پر ایک بڑا سا کو ایک پنکھہ کالا ایک پنکھہ سفید، آنکھیں موندے، چوچی پروں میں دیئے بیٹھا ہے۔ پوڈنے نے قریب جا کر بڑے ادب سے کہا کہ ”اے کامنی، ہم دور سے چل کر تمہارے پاس آئے ہیں۔“

کامنی نے آنکھیں کھولیں۔ پوچھا ”کارن؟“

”کامنی، ہم تم سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ آدمی کو عقل کب آئے گی۔“

کامنی نے تھنڈا سانس بھرا ”بھولے پچھوئی، تم نے میرے ساتھ وہی کیا جو میں نے اپنے باپ کے ساتھ کیا تھا۔“

”کامنی، تم نے اپنے باپ کے ساتھ کیا کیا تھا۔“

”میرا باپ،“ کامنی سنانے لگا ”تپ میں تھا۔ ہزار برس تپ میں گزر چکے تھے۔ اس سے اس کے پروں کی ساری کالونس دھل پکھی تھی۔ ایک پنکھہ پر بس ایک کالی نکلی باقی رہ گئی تھی۔ اس پیچے میں اس کے پاس پہنچا اور یوں بولا کہ اے میرے باپ ایک بات پوچھوں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا ”پوچھ۔“ اب میں پوچھتا ہوں کہ آدمی کو بھی عقل آئے گی یا نہیں آئے گی۔ باپ نے مجھے گھور کے دیکھا، پتہ تو کدھر سے آ رہا ہے۔ باپ میں اڑتا اڑتا کو روکشیتر کی اور نکل گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ آدمی کو مار کاٹ رہا

ہے اور خون کی ندیاں بہرہ ہیں۔ باپ نے مختنہ انس بھرا بولا پتہ میں نے تجھے منع کیا تھا کہ سب کھوٹ جانا، مانو کھوٹ مت جانا۔ اور کبھی آکر مجھ سے اس کی بات مت کرنا۔ ہم کوے لوگ پہلے اجلے ہوا کرتے تھے۔ آدمی کا و بال ہم پڑا ہے کہ ہم کا لے ہو گئے ہیں۔ یہ تپ میں اسی لئے کھنچ رہا تھا کہ یہ و بال اترے اور ہم پھر اجلے ہو جائیں۔ پر تو نہ مانا، مانو کھوٹ گیا اور آکر مجھ سے اس جاتی کی بات کی تو نے میرے تپ کو بھنگ کر دیا۔ اس کے ساتھ میری عمر ختم ہوئی۔ تجھے میں ساہس ہوتا ہے تو میرے تپ کو پورا کر اور اپنی جاتی کے گئے ہوئے اجلے پن کو واپس لَا۔ یہ کہہ کر اس نے پران دے دیئے۔ میں نے اس کے جانے کا شوک کیا اور تپ کے لئے بیٹھ گیا۔ سو میں تپ میں تھا کہ تم نے آ کر اس میں مختنہ ڈال دی۔ اب میں یہاں سے اٹتا ہوں اور کسی زخم بن میں باس کرتا ہوں جہاں میرے کان میں آدمی کا نام نہ پڑے۔

یہ کہہ کر کا گامنی نے پر پھر پھر ائے اور اڑنے کے لئے تیار ہوا پوڈنے نگھبرا کر جلدی سے پوچھا "مگر منی جی، ہمارے سوال کا جواب اب کہاں سے ملے گا۔"

کا گامنی نے تامل کیا پھر بولا "یاں سے وکھن کی اور تاپتی ندی کے پاس شوچی کا پرانا مندر ہے۔ اس کے کھل پا ایک نیل کنٹھ بیٹھا ہے کہ جکوں کے بھید جاتا ہے۔ اس سے جا کر پوچھو۔"

پھر پوڈنہ آگے آگے تھا اور مور مور فی چکوا چکوئی، طوطا مینا اور کتنے دوسرے کہ رستے میں ساتھ ہوئے تھے پچھے پچھے اڑتے اڑتے تاپتی ندی کے پار شوچی کے پرانے مندر پہنچ۔

نیل کنٹھ نے پروں کی پھر پھر اہٹ اور بھانت بھانت کی چکار سن کر آنکھیں کھولیں "متروکس دیں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو۔"

"مہاراج" پوڈنے ادب سے کہا "ہم دور سے پتہ پوچھتے پوچھتے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ایک سوال ہمیں در در لئے پھر رہا ہے۔ جس سے پوچھتے ہیں وہ کتنی کاٹ جاتا ہے۔ سب طرف سے ما یوس ہو کر آپ سے پوچھنے آئے ہیں۔"

"پوچھو مترو۔"

"مہاراج" ہم آپ سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ آدمی کو کب عقل آئے گی۔"

نیل کنٹھ نے حیرت سے پوڈنے کو اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ کہا "بھولے پنچھی کیا تمہاری مت ماری گئی ہے کہ ایسا پوچھتے ہو۔ مجھے نہیں دیکھتے کہ میری ساری گردان نیلی ہو رہی ہے۔ سمندروں میں جوش گھلا ہوا تھا کس مشکلوں سے میں نے اس سارے وش

ہے۔

”مہاراج، پودتا بولا“ یہی فکر تو ہمیں کھائے جا رہی ہے کہ اس نادان کو کبھی سمجھا آئے گی بھی یا نہیں۔“

”پنچھو، نیل کنٹھ نے انہیں سمجھاتے کہا“ ہر پنچھو پنچھی کے پاس اپنے اپنے حصے کی عقل ہے۔ پر آدمی نرالا پشو ہے کہ اسے ذہن تو ایسا ملا کہ آسمان میں تھنگی لگاتا ہے پر عقل نہیں ملی۔“

پود نے آدمی کے حال پر افسوس کیا اور کہا ”مہاراج اگر میں اپنے حصے کی عقل آدمی کو دے دوں تو پھر تو اس میں کچھ سو جھ بو جھ آجائے گی ہا؟“

نیل کنٹھ ادای سے ہنسا اور بولا ”پود نے“ کیا تو نے اس کوے کی کہانی نہیں سنی جس نے آدمی کو عقل سکھانے کی کوشش کی تھی۔“

اور نیل کنٹھ نے انہیں کہانی یوں سنائی کہ اب سے بہت پہلے ایک آدم تھا۔ سمجھو کہ اس دھرتی پر پہلا پرش۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹے نے جو کہ بہت مورکھ تھا دوسرے کی تھیا کر دی۔ کرنے کو کتو کر دی پر اس پر تھیارے کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی لاش کا کیا کرے۔ اس مورکھ نے بھائی کی لاش کو کمر پلا دا اور چل پڑا۔ ساری دھرتی کھونڈ ڈالی پر مت ایسی ماری گئی کہ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کہاں سُکھانے لگائے۔ اس کی کرد کھنے لگی۔ ایک کوے نے اسے اس حال میں دیکھ کر ترس کھایا اور کہا کہ عقل کے اندر ہے بھائی کی لاش کو کمر پلا دے کب تک پھرے گا۔ اس نے دیکھی ہو کہا کہ پھر کیا کروں اور کیسے اس بوجھ کو اتاروں۔ کوے نے کہا کہ گڑھا کھود اور اس میں اسے داب دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کوے نے جب اپنے باپ کو یہ بات سنائی تو اس نے سر پیٹ لیا۔ پتیری تو نے کیا کیا۔ کوہ بہت پٹپٹایا کہ آخر اس نے ایسا کون سا پاپ کر دیا۔ ”ارے پاپ سا پاپ“ کوے کا باپ بولا ”ہم اجلے پنگھوں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ اب اس کا رن ہمارے پنگھ کا لے پڑ جائیں گے۔“

”باپ ہمارے پنگھ کس کا رن کا لے پڑ جائیں گے۔ میں نے تو اس مورکھ کو عقل کی بات بتائی تھی جو اس کے بھٹے میں تھی۔“

”بھولے یعنی“ مورکھ کو عقل کی بات بتانا ایسے ہے جیسے بندر کے ہاتھ میں استر ادے دیا جائے۔ اب یہ مورکھ پتہ ہے کیا کرے گا۔ سدا پاپ کرے گا اور تیری بتائی ہوئی ترکیب سے پاپ کو چھپایا کرے گا۔ وہاں اس کا ہم پر پڑے گا کہ ہمارے اجلے پر کا لے ہو جائیں گے۔“

پرندے یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے اور طو طے مینا کی آنکھیں توکھی کی توکھی رہ گئیں۔“

پودنے نے لمبے تامل کے بعد سوال کیا ”تو مہاراج پھر کیا کیا جائے نیل کنٹھ نے کہا“ مترا اپنی عقل اپنے ساتھ۔ کوئی کسی کو عقل نہیں سکھا سکتا۔ جو مور کھہے وہ مور کھہی رہے گا۔ آدمی مور کھہے ہے۔“

یہ کو راجواب سن کر وہ پرندے وہاں سے اداں اداں لوٹے۔ اپنے جنگل میں آ کر اپنی اپنی شاخ پر بیٹھ گئے۔ سب اپنی اپنی جگہ چپ تھے اور اداں طوطے مینا پر تو جیسے اوس پڑگئی ہونہ طوطے نے چوچ کھولی نہ مینا کچھ بولی۔

چکوی سے رہانے گیا۔ چکوے سے بولی ”میرے سرتاج، طوطے اور مینا کو کیا ہو گیا ہے کہاں رات رات بھر آدمزاد کے قصے سناتے تھے جیسے دنیا میں آدمزاد کے سوا کوئی نبی مخلوق بستی ہی نہیں اور کہاں اب ایسی چپ سادھی ہے کہ جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔“

چکو اسکرایا۔ بولا ”جانم اب نہیں عقل آگئی ہے۔ آخر کو پھرے سے باہر نکل آئے ہیں۔“



## بخت مارے

ایک دہشت نے آنا فانا انہیں آلیا تھا۔ اور پر کاسنس اور پر نیچے کا سنس نیچے جیسے سنس لیا تو پستول کی لٹلی دبے گی اور ان کے سنس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے نوٹ جائے گا جو نوجوان پستول تانے اکڑا کھڑا تھا اس نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو گولی اس کے سینے کے پار ہو گی۔ شبیہ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کمرے میں سب اپنی اپنی جگدا پہنچا پہنچنے بستر و میں دم بخود بیٹھے تھے۔ ساکت جیسے پتھر کے بننے ہوں۔ اور اماں جی تو بالکل ہی بت بن گئی تھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ انہیں کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جا گی ہی نہ ہوں؛ بس ایک ڈراؤن خواب دیکھ رہی ہوں۔ سب سے زیادہ دہشت زدہ وہی تھیں۔ مگر سب سے پہلے دہشت کے اثر سے بھی وہی نکلیں۔ دہشت کی گھری طوالت کی متحمل نہیں ہو سکتی اور آدمی تناہوا کتنی دیر رہ سکتا ہے تو ہوا یوں کہ اماں جی کتنی دیر تک خوف میں ڈوبی بے سدھ بیٹھی رہیں۔ مگر رفتہ رفتہ اس طلب نے جو ان کی جان کے ساتھ گلی ہوئی تھی ان کے اندر سراخھایا۔ انہیں جما یاں آنی شروع ہو گئیں جن کا صاف مطلب یہ تھا کہ انہیں اب پان کی طلب ستارہ ہی ہے۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی کہ رات کے بیچ آنکھ کھلنے پر وہ پلنگ پروہ پلنگ کے برابر کھی ہوئی چھوٹی سی میز کو قریب گھسیتیں پان بنانے کے لیے اڑھ میں رکھتیں اور پھر فوراً ہی سو جاتیں۔ مگر آج جس عالم میں جا گئی تھیں وہ تو عالم ہی اور تھا۔ بس ایک ڈراؤنے خواب کے بیچ جا گئی تھیں۔ ایسے عالم میں تو بھوک پیاس اڑ جاتی ہے۔ پان کی طلب تو دور کی بات ہے کتنی دیر تک وہ بس خوف کی پوٹ بنی بیٹھی رہیں کسی اور بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ لیکن آخر کتب تک۔ ڈراؤن خواب طول کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ اماں جی کو جما یاں آنی شروع ہو گئیں۔ ان جما یوں نے انہیں احساس دلایا کہ کتنی دیر سے انہوں نے پان نہیں کھایا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی ان کی نظریں میز پر رکھے پانداں پر گئیں۔ ویسے تو میز پلنگ کے قریب ہی تھی مگر اچانک وہ بہت دور سرک گئی تھی۔ قریب رکھا ہوا پانداں کتنی دور چلا گیا تھا جیسے سات سمندر پار سے للچارہا ہوں۔ لمحہ بھر کے لئے یہ فاصلہ درمیان سے غائب ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ میز کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ سامنے تناہوا پستول جیسے بالکل سینے پر آگیا ہو۔ اماں جی پھیلنے سے پہلے پھر سمت گئیں۔

پستول کی دہشت اور پان کی طلب کے بیچ ڈانواڑوں اماں جی سخت اذیت میں تھیں۔ پانداں تک رسائی کیسے حاصل کی جائے؟ بس اس مسئلے نے انہیں اپنے گھرے میں لے لیا۔ باقی سارا قصہ پس منظر میں چلا گیا۔ کتنی دیر تک وہ اس ادھیڑ بن میں رہیں کہ

پانداں کو کس طرف اپنی طرف سر کا یا جائے کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی پھر کیا کیا جائے۔ پان تو بہر حال کھانا ہے آخر کو ماں جی نے اسی نوجوان سے ”رجوع کیا جو سامنے پستول تانے اکڑا کھڑا تھا۔“ اے بیٹا۔“ کس لجاجت سے اس سے مخاطب ہو گیں۔ ”تم ابڑا احسان ہو گا۔ یہ میرا پانداں جو ہے ناذرا میری طرف سر کا دے۔ بس ایک کتر منہ میں رکھوں۔“

”خاموش“ نوجوان نے کڑک کر کہا اور پستول کو ایسے گردش دی جیسے چلانے لگا ہے ”ابنی جگہ سے کوئی ہلا تو گولی مار دوں گا۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے غضبناک نظروں سے ایک ایک کو دیکھا، اماں جی کو ان کی بہو کو جسے گھر کی بیگم سمجھنا چاہئے، اس نوجوان لڑکی کو جو اماں جی کی پوتی اور اس بی بی کی بیٹی تھی، اس ادھیز عمر شخص کو جو اماں جی کا بیٹا تھا۔ سب ایک مرتبہ پھر دہل گئے۔ اور سانس پھر اور پر کا اوپر نیچے کا نیچے۔

دو سندے مشنڈے کے تھوڑی دیر پہلے پستول کے زور پر حکم سے تالیوں کا گچھا لے کر سور کے اندر گئے تھے بجلی کی تیزی سے پستول تانے باہر لٹکے گھور کے ساکت و جامد مکینوں کو تھہ بھری نظروں سے دیکھا۔ ان میں جو سینر نظر آتا تھا وہ نوجوان سے مخاطب ہوا ”کامریڈ کیا بات ہے؟“

”باس، یہ بڑھایا بولتی ہے۔“  
”کیا بولتی ہے۔“

”پان کھانا مانگتی ہے۔ بولتی ہے ہمیں پانداں دیدو۔“

”پانداں؟“ اور باس کی تیز شک بھری نظریں پانداں پر مرکوز ہو گئیں۔ ساتھی سے جو اس کے ساتھ سور سے نکلا اور جسے اس کا نمبر 2 سمجھنا چاہئے مخاطب ہوا ”کامریڈ تم اپنا کام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ پانداں کا کیا چکر ہے۔“

”باس ضرور اس میں کوئی چکر ہے۔“ نمبر 2 نے کہا اور فوراً ہی واپس سور میں چلا گیا۔

”باس نے پانداں کا تفصیل سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس خانے کا زیادہ تفصیل سے جائزہ لیا جس میں اڑم سڑم چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ملی دلی پیچک اس میں اڑی ہوئی دھاگہ پڑی ہوئی ایک سوئی رنگ برلنگے بنن، تڑی مڑی ایک انگوٹھی، ایک سرمد والی وغیرہ وغیرہ۔

”بیٹے ذرا احتیاط سے دیکھنا کھمائیں نے آج ہی بھرا ہے۔ کھلیا ذرا بھی چھکلی تو سارا پانداں خراب ہو جائے گا۔“

”خاموش۔“ نوجوان ایک وقعدہ پھر کڑکا۔

کڑک تو اس آواز میں ولیکی ہی تھی۔ مگر اس کا اثر اس بارویسا نہیں ہوا جیسے پہلے ہوا تھا۔ اماں جی نے تو جیسے سنا ہی نہ ہو۔

”اماں جی۔“ بیٹھے نے اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے بے بی سے ماں کو دیکھا ”انہیں اپنا کام کرنے دیں۔ مت ٹوکیں۔“

پانداناں سے جب کچھ برآمدہ ہوا تو باس نے بیزاری سے اماں جی کی طرف سر کا دیا ”لے بڑھیا تو پان کھا۔“ اور اٹھ کر تیزی سے سور کی طرف چلا گیا۔

اماں جی تو کھل انھیں۔ کس شوق سے انہوں نے پانداناں اپنی طرف سر کایا۔ کھول کر گیلے کپڑے میں تھے کہ ہوئے پانوں میں سے ایک پان نکالا احتیاط سے لگایا اور منہ میں رکھ لیا۔ اب کہیں جا کر جان میں جان آئی۔ پھر انہوں نے سروطہ نکالا اور تھوڑی چھالیاں۔ کلے میں پان ہاتھ میں سروطہ سروٹے کی پیچ چھالی۔ اماں جی اب کتنی آسودہ نظر آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں باس اور نمبر 2 دونوں سور سے نکل آئے۔ باس نے کلائی پر بندھی گھری دیکھی ”کامر یہ ہم جلدی بنت گئے۔“

ہاں وہ جلدی ہی بننے کی قسم کی مراجحت جو نہیں ہوئی۔ بیگم اور بیٹی دونوں ہی نے بہت خاموشی سے اپنے زیوراتا رکرانے کے حوالے کر دیئے تھے۔ بیٹی کو بھی خیریت اسی میں نظر آئی کہ جس جس شے کا پتہ پوچھتے ہیں انہیں بتا دو۔ سیف کی چابیاں بغیر کسی خیل و جھٹ کے ان کے حوالے کر دی گئیں۔ بیگم نے چابیوں کا پورا کچھا لٹکنے کے نیچے سے نکال کر یوں کردیا جیسے سر پر بوجھ تھا کہ اتار کر فراگت پائی۔

”وین کس وقت آئے گی۔“ نمبر 2 نے پوچھا۔

”اس کے آنے میں تو ابھی خاص وقت ہے۔ پھر بدلنے کے وقت کی شہری تھی۔“

”پھرے والوں سے بات کر لی ہوتی تو ہم جلدی جاسکتے تھے۔“

”بات کی تھی۔ سالے بہت ڈیمانڈ کر رہے تھے۔ میں نے کہا جاؤ سالوں میں تمہاری مد نہیں چاہئے۔“

”باس پھر اتنی دیر کیا کریں گے۔“

”ہاں واقعی بہت بور ہوتا پڑے گا۔“ رکا۔ پھر بولا ”ہاں ایک پروگرام ہو سکتا ہے۔“

”گیا؟“

”چائے ہو جائے۔“

”گذ آئیں گے۔“

باس نے ایک نظر بیگم پرڈاں جو کب سے گم سہی تھی۔ ”بیگم صاحب“ اب اس کے لہجے میں بہت زمی اور ساتھ میں شائستگی بھی آ گئی تھی ”آپ کو تھوڑی رحمت کرنی پڑے گی۔“ پھر نمبر 2 نے پستول تانا اور بیگم کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں چائے بن کر آ گئی۔ باس نے ایک پیالی بنایا کرنو جوان ساتھی کی طرف بڑھائی جو بدستور پستول تانے مستعد کھڑا تھا اس طرح کہ گھر کے سارے مکین اس کی کڑی نظر کی رو میں تھے۔

”کامریڈ“ تھوڑا Relax ہو جاؤ اور چائے پی لو۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ یہ شریف لوگ ہیں۔ اور ہم موجود ہیں۔“ نوجوان نے چائے کی پیالی سنبھالی۔ اس کے ساتھ ہی کسی قدر ڈھیلابھی پڑ گیا۔ لیکن چائے پیتے ہوئے جس طرح کڑی نظر وہ سے دمکتیں کو دیکھ رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ اب بھی وہ پوری طرح چوکس ہے۔

بہر حال فضائیں وہ پہلا ساتھ نہیں تھا۔ چائے کی پیالیوں کی کھنکناہٹ جیسے دہشت کے رنگ کو کاٹتی چلی جا رہی ہو۔ چائے چیز ہی ایسی ہے۔ چائے کی پیالی باتھ میں تھام کر آ دی تنا ہو انہیں رہ سکتا۔ تو جیسے چائے کی پیالیوں کے ساتھ کوئی نیا غصہ فضائیں سراپا کر گیا ہو۔ فضائیں تبدیلی کا پہلا اثر اس طرح ظاہر ہوا کہ لڑکی نے جواب تک کہی ہمیں گم سہی تھی سکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ساری نظریں ایک دم سے اس پر مراکوز ہو گئیں۔ باس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ دیکھا رہا۔ پھر اس جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”یہ کیوں رو رہی ہے۔“

”بیٹے وہ اپنی تقدیر کو رو رہی ہے۔“ اماں جی نے افسر دی سے جواب دیا۔ پان چباتے ہوئے سروٹے سے چھالیاں کترتے ہوئے وہ کسی قدر آسودگی محسوس کر رہی تھیں۔ لیکن نواسی کو اس طرح سکیاں لے کر روتے دیکھ کر وہ افسر دہ ہو گئی تھیں۔

”تقدیر کو؟ کیا ہوا اس کی تقدیر کو؟ باس نے پھر اسی حیرت سے پوچھا۔

”اے ہے کچھ ہوا ہی نہیں بخت مار و خدا کے خوف سے ڈرو۔ تم نے اس غریب کی مغلکی کی انگوٹھی ہتھیا لی اور پوچھ رہے ہو کہ کیا ہوا۔ بیٹے یہ سونے چاندی کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے ہم نہیں روکیں گے۔ سمجھ لیں گے کہ جانوں کا صدقہ تھا چلا گیا۔ مگر یہ تو شکن کی بات ہے۔“ پھر لڑکی سے مخاطب ہو گیں۔ ”بیٹی آنسو پوچھ لے، صبر کر۔“

باس کچھ شپٹا سا گیا۔ پھر نمبر 2 سے مخاطب ہوا ”کامریڈ“ اس کی انگوٹھی واپس کر دو۔“

اب نمبر 2 کے شپٹا نے کی باری تھی۔ بات بناتے ہوئے بولا ”ڈھیر میں کہیں رلی ملی ہو گی۔ بہت ٹھوٹا پڑے گا۔“

”کوئی بات نہیں۔ ٹھوٹا اور واپس کرو۔“

نمبر 2 نے لاچار زیورات کی گھٹھری کھولی۔ کتنی دیر تک مٹوٹا رہا۔ بس کی نظریں اس پر جھی ہوئی تھیں۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لار آخراں نے انگوٹھی برآمد کی اور بس کے حوالے کردی۔ بس نے انگوٹھی لے کر لڑکی کے حوالے کی اور بہت زمی سے بولا ”لے بی بی اپنی انگوٹھی پہن لے۔“

اماں جی نے اس واقعہ کو اپنی فتح شمار کیا۔ سواب وہ زیادہ اعتماد کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ نظر آرہی تھیں۔ اور ادھران نو واردوں کا موڈ بھی تو اچھا خاصابدل چکا تھا۔ چائے کا تو جواہر ہوا وہ ہوا مگر لڑکی کے رو نے نے تو جیسے فضا کو بالکل ہی بدل دیا ہو۔ نہیں بدلا تھا تو وہ نوجوان جس کی نقل و حرکت بتا رہی تھی کہ بس کی مشفقاتہ ہدایت کے باوجود وہ اسی طرح اکڑا ہوا ہے۔ سو جب اماں جی نے اپنا نیا سوال انٹھایا تو وہ پھر پہلے کی طرح تن گیا۔

اماں جی نے سادگی سے پوچھا ”اے بیٹو! برامت مانا دیے تم جاؤ گے کس وقت۔“

نوجوان نے تیزی سے پیالی میز پر رکھ پستول تان لیا۔ ”خاموش“ سب گم چہروں پر بجلی ایسی دوڑتی نظر ڈال کر ”کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو گولی مارووں گا۔“

اس تنبیہ کا اثر اس مرتبہ پہلے سے بھی بھی کم ہوا۔ اماں جی تھوڑے تفعیل بھج میں بولیں ”اے بخت مارے ہوش کی دوالي۔ تو تو میرے حلق کا دار و غدہ بن گیا۔“

باس نے نوجوان کو متانت سے ٹوکا ”کامریڈ“ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اماں سے مجھے بات کرنے دو۔“ اس کے لہجہ میں کتنی تبدیلی آگئی تھی کہ جیسے اس نے پہلے بڑھایا کہا تھا اب اماں کہہ رہا تھا۔ اماں جی سے مخاطب ہوا ”اماں جی، آپ کیا چاہتی ہیں۔“

”اے بینا“ میں کیا چاہتی۔ مجھ کاں کھاتی نے بس اتنی ہی بات پوچھی تھی کہ خیر سے تم کب جا رہے ہو۔ وہ بھی بینے میں نے اس لئے پوچھ لیا کہ میرے وظیفہ کا وقت قریب آ رہا ہے۔ کہیں تمہارے چکر میں میرے وظیفہ میں کھنڈت نہ پڑ جائے۔ کھنڈت پر گئی تو غضب ہو جائے گا۔“

”غضب ہو جائے گا۔ کیا غضب ہو جائے گا۔“

”کیسے غضب نہیں ہو جائے گا۔ معمولی عمل تھوڑا ہی ہے۔ جلالی وظیفہ ہے۔“

”جالالی وظیفہ؟“ بس پھر کچرا یا۔

”اے بینا کیا بتاؤں، ہمارے گھر میں تو پریشانیوں نے گھر کر لیا ہے تو میں نے جلالی وظیفہ شروع کر دیا۔ جلالی وظیفہ سے دل در دور

ہو جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ ابھی وظیفہ شروع ہی کیا تھا کہ اپنی بھی کی ملکتی طے ہو گئی تو اللہ چاہے تو ہماری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ مگر بھیا یہ جلالی وظیفہ ہے جان جو کھوں کا معاملہ اگر کھنڈت پڑ جائے تو پھر تو قبرٹ پڑتا ہے۔ اس وظیفہ میں جنات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی لئے تو میں پوچھ رہی ہوں اپنے اور تمہارے دونوں کے بھٹکے کے لئے کہ میرے وظیفہ کے وقت تک خیر سے چلے جاؤ گے۔"

"اماں جی، آپ کا وظیفہ کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"بس ادھر مرغ نہ بولے اور ادھر میں انھی۔ دور کعت نماز جمکری۔ اور اس کے بعد حصار باندھ کے وظیفہ کے لئے بیٹھ جاتی ہوں۔ حصار باندھوں تو جنات تو مجھے کچا چا جائیں۔"

باس سوچ میں پڑ گیا نمبر 2 کی طرف دیکھا "کامریہ" کیا اس سے پہلے ہم جاسکتے ہیں؟"

"باس، ابھی اسی وقت جاسکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

باس نے معنی خیز نظروں سے نمبر 2 کو دیکھا۔ دونوں نے اشاروں میں تبادلہ خیال کیا۔

"اوکے۔" بس نے کہا اور پھر فوراً پستول تان کر اماں جی کے بیٹھے کے سر پہ جا کھڑا ہوا۔ "دیکھئے ہم ابھی جانا چاہتے ہیں مگر اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ اپنی گاڑی کی چابی ہمارے حوالے کریں۔ واپس مل جائے گی آپ کو گاڑی ہم کسی کی نہیں لیتے۔"

اس شریف آدمی نے گاڑی کی چابی خاموشی سے اس کے حوالے کر دی۔ بس جھٹ پٹ وہ منتخب سامان جو چھانٹ کر الگ رکھا گیا تھا گاڑی میں لا دا گیا۔ جب چلنے لگے تو بس اس کے پاس آیا کہا "دیکھئے پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش مت کیجئے گا۔ اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ نقصان البتہ پہنچ سکتا ہے۔ آپ صح کو اپنی گاڑی شالamar سور کے قریب پک کر سکتے ہیں۔ چابی گاڑی میں ہی ہوگی۔ کوئی غلط آدمی اسے نہیں چھیڑے گا۔" اوکے" یہ کہہ کر وہ فوراً باہر نکل گیا۔

سب سے آخر میں نوجوان گیا۔ جاتے جاتے رکا۔ کچھ ٹھوک کا پھر پلت کر اماں جی کے قریب آیا اور لجاجت سے بولا "آپ وظیفہ

پڑھ رہی ہیں نا؟"

"ہاں پینا۔"

”اماں جی، بات یہ ہے کہ کل میرا انٹر دیو ہے۔ اور اماں جی، آپ کو تو پتہ تھی ہے کہ اوپر سے نیچے تک سب سالے کر پڑتے ہیں۔ رشوت کھاتے ہیں تو رشوت چلتی ہے یا پھر سفارش ہو۔ میرے پاس دونوں میں سے کچھ نہیں ہے۔ تو اماں جی، وظیفہ میں آپ مجھے بھی یاد رکھیئے۔ بس دعا کرو دیں۔ میرا کام بن جائے گا۔“

نہ ہاں نہ ناں، بس اماں جی اسے تک رہی تھیں تھوڑی درود مندی کے ساتھ مگر پھر وہ رکا کہاں۔ یہ کہا اور عجلت سے باہر نکل گیا۔ اماں جی کتنی دیر تک اسی طرح گم سم بیٹھی رہیں۔ سرو طہ ہاتھ میں چلتا رہا۔ پھر مرغ نے کی بانگ پر ہڑبڑا کر انھیں۔ وضو کرتے ہوئے بڑبڑا بھیں۔ ”بخت مارے۔“



## داع اور درد

ہر حیرت کی ایک معیاد ہوتی ہے۔ سورفتہ رفتہ بات آئی گئی ہو گئی اور طلاق سے نئی شادی تک سارا ذرا مادہ اپنی ڈرامائیت کھو کر برادری کے بھولے بسرے قصوں میں رل مل گیا۔ تو قیر کی واپسی پر یہ سارا قصہ ایک نئی آب و تاب کے ساتھ حافظوں میں تازہ ہو سکتا تھا کہ لوگ ظالم ہوتے ہیں اور برادری کنبہ کی بڑی بوڑھیوں کا حافظہ کہاڑ کوٹھڑی ہوتا ہے۔ جس میں دبے پڑے سات پشتوں کے قصوں قشیوں میں سے کوئی بھی قضیہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر برآمد ہو جاتا ہے مگر ہوا یوں کہ زمانے بعد جب تو قیر آئی تو ایک پھول سی پنجی اس کی انگلی پکڑے بیرون پر چل رہی تھی اور ایک ستارہ سا بچ گود میں ہمک رہا تھا۔ خود وہ سونے میں پیلی ہو رہی تھی۔ منظر یہ کہ ہر پہلو سے بھاری تھی۔ ڈھکا چھپا تو ان کا اگنا جاتا ہے جن کا پلہ کی طور پہلا ہو۔ بڑی بوڑھیوں کی بھی تو اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ وہ ایسی بن گئیں جیسے پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ سب اس پر صدقے واری ہو رہی تھیں اور اونچ سچ سمجھارہ تھیں۔

”اے بٹوایے انخاؤ چوہا بتنی کب تک دیں پھروگی آدمی کا کوئی بخور بخکانہ تو ہونا چاہیے۔ اللہ کھوآل اولاد و والی ہو۔ بھی آج چھوٹی ہے کل سیانی ہو جائے گی۔ اور لڑکی تو بہت جلدی جلدی سیانی ہوتی ہے تو اس کے بیاہ شادی کے لئے یہیں آکر بیٹھوگی تو کوئی شکانہ تو ہونا چاہیے۔“

”تو قیر ہننوں“ پھمبوں نے ٹکڑا لگایا ”نئی تائی تمہارے بھلے کی کہہ رہی ہیں۔ اللہ قسم ایک مکان بنالو۔ ارے چھوٹی چھوٹی آمد نیوں والوں نے منزلیں کھڑی کر لی ہیں۔ تمہارے لئے تو ماشا اللہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ اس میل کو کہیں لگاؤ۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ ہماری تو قیر حومی والی کہلاۓ۔“

”میں کہتی ہوں کہ آدمی کو ہمیشہ دور کی سوچتی چاہیے۔“ نئی تائی نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی ”آخر تمہارے دلہما کی کسی روز پتشن بھی ہوگی۔ پھر تو کہیں تھل سے بیٹھوگی۔ کہیں کیا یہیں آ کر رہوگی۔ تو آج لکھ تملے ہیں۔ اس وقت پیسہ پکڑ کے خرچ کروگی۔ اب جو کروگی اس وقت اس کا تمہیں فیض ملے گا اور پیسہ تو آتا جاتا رہتا ہے مگر مکان تو کھڑا رہتا ہے۔“

بات کام کی تھی۔ تو قیر کے اندر اتر گئی۔ اگلے پھیرے میں زمین خرید کر ڈال گئی۔ پھر سال دو سال بعد آئی تو مکان کی تعمیر کا ڈول ڈال دیا اور اس کے پھیرے جلدی جلدی پڑنے لگے۔ اصل میں اب اس کا اپنے آپ میں اعتماد پوری طرح بحال ہو چکا

تحاکس لٹھے کے ساتھ وہ اپنے مکان میں آ کر برا جتی تھی۔ برادری کے سارے قصے قضیوں میں اس طرح حصہ لیتی جیسے وہ مستقل وہاں رہ رہی ہو۔ اور اس کے پچھے گلیوں میں اس طور کو دتے پھاندتے پھرتے جیسے وہیں اس کی تال گڑی ہو۔ بلواب اچھا خاصاً بڑا ہو گیا تھا۔ گلیوں میں ڈنڈے بجاتے لڑکوں بالوں کے ساتھ گھومتا پھرتا۔ کبھی خالی پت کر کبھی ساتھ میں کپڑے پھردا کر گھر لوٹتا اور پھر تو قیر کے ہاتھوں پٹتا۔ مگر ایک روز ایک اور ہی رنگ سے خوار ہو کر روتا بسورتا گھر پہنچا۔

”کم بختی مارے“ کیا ہوا۔ کیوں میری جان کو رو رہا ہے۔“

”میری ٹوپی“ بونے سورج ہوئے کہا۔

”کیا ہوا تیری ٹوپی کو۔“ اچانک سر پر نظر پڑ گئی اور تو قیر چلائی ”ناس پنے“ نئی ٹوپی تھی کہاں کھوائے ہو۔“

”وحیدا لے گیا۔“

”وحیدا لے گیا؟“

”ہاں اس نے میرے سر سے اچھی اور بھاگ گیا۔“

گھر میں سب ہنسنے لگے۔ تو قیر بھی نہ پڑی۔ اصل میں یہ تو وحیدا کا عام طریقہ واردات تھا۔ کسی کے سر پر ٹوپی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دیے اس کی دیوالی کی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اپنے آپ سے بتیں کرتا، اپنے حال میں گم گلی گلی گھومتا پھرتا تھا۔ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی کم ہی دیکھتا تھا۔ لیکن جہاں کسی سر پر ٹوپی نظر آئی اس نے جھر جھری لی۔ ٹوپی اچھی اور یہ جاؤ جا۔ ایسا اڑنچھو ہوتا تھا کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ گیا کدھر چھوٹوں اور بڑوں کے کتنے سروں سے کیسی کیسی بانکی ٹوپیاں غائب ہو چکی تھیں اور کبھی سراغ نہ ملا کہ وحیدا ٹوپی کہاں جا کر چھپاتا ہے اور اس کا کیا کرتا ہے۔ کتنے بڑوں کے سروں پر بھی ترچھی بانکی ٹوپیاں غائب ہو چکی تھیں۔ چھوٹوں کا توڑ کر ہی کیا۔ بلو کی بالکل نئی ٹوپی تھی۔ تو قیر نے کس چاؤ سے محل کی اس ٹوپی پر سلدستارے نالے تھے۔ اسے غصہ آنا ہی تھا۔ تاؤ کھا کر بولی کہ اے ہیضہ کی کلی آئے میرے لال سے اسے کیا دشمنی تھی کہ اس کی ٹوپی اچک کے لے گیا۔“ مگر جب اس نے دوسروں کو ہنستے دیکھا تو خود بھی نہ پڑی اور بلو کو سمجھا نے لگی ”چپ ہو جا میرے لال۔ وہ تو دیوانہ ہے۔ دیوانوں کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ میں تجھے اس سے اچھی ٹوپی بنائے دوں گی۔“

اصل میں تو قیر کا رو یہ بھی اب وحیدا کے سلسلہ میں وہی تھا جو باقی سب کا تھا۔ اب یہ کے یاد تھا کہ وحیدا پہلے کون تھا، شاید تو قیر کو بھی نہیں اب تو یہی لگتا تھا کہ وہ سدا سے پاگل چلا آتا ہے اور یہ کہ پوری بستی میں اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے۔ دیوالی کا یہی

کمال ہے کہ وہ آدمی کو رشتہوں ناطوں کے جھمیلے سے رہائی دلا دیتی ہے تو اب وحیدا صرف اور محض پاگل تھا لوگوں کے بیچ مگر لوگوں سے تعلق لوگ اس سے بے تعلق تھے۔ پہلے کوئی تعلق ہو گا مگر کب اور کیسے کسی کو یاد نہیں تھا۔ یاد کرنے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ بس اب تو اسی واسطے تعلق رہ گیا تھا کہ کسی کی کوئی ٹوپی اچھی جاتی لیجیو دوز یو ہوتی۔ جب اس کا پتہ نہ چلتا اور ٹوپی برآمد نہ ہوتی تو یہ سوچ کر صبر کر لیا جاتا کہ پاگل ہے کیا کیا جائے۔ تو قیر نے بھی بھی سوچ کر صبر کر لیا۔ اور پھر چندی دنوں بعد تو تو قیر واپس چل گئی تھی۔

ذی ہدود سال بعد جب تو قیر پھر آئی تو یہ واقعہ نہ بلوکو یاد تھا نہ تو قیر کو۔ تھا ایسا کون سا بڑا واقعہ کہ یاد رہتا۔ ایک ٹوپی ہی کی توبات تھی، آئی گئی ہو گئی۔ ویسے بھی اس مرتبہ تو قیر کی مصروفیت بہت تھی۔ نینی کی شادی سر پر سوار تھی۔ برادری کی بڑی بوڑھیوں نے اسے صحیح سمجھایا تھا کہ لڑکی جلدی ہی سیانی ہوتی ہے۔ آج چھوٹی ہے کل بڑی ہو جائے گی۔ سو وہ ہو گئی تھی اور اب اس کی شادی ہونے لگی تھی۔ شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور دوڑی چلی آرہی تھی۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ تو قیر رات دن تیار یوں میں لگی رہتی تھی۔ مشی جی کے تو قیر کے گھر بار کے منتظم تھے۔ دن رات ایک ناگ پکھڑے رہتے تھے۔ ویسے تو انہیں فرصت ہی رہتی تھی۔ تو قیر کی کون ہی لمبی چوڑی جائیداد تھی۔ ایک مکان ہی تو تھا۔ تو قیر کی عدم موجودگی میں چوتھے پیشے ہوتے رہتے تھے۔ باقی گھر بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ چند دنوں کے لئے جب تو قیر آتی تو گھر آباد ہوتا اور مشی جی مصروف نظر آنے لگتے تھے۔ تھوڑے دن کی مصروفیت رہتی۔ تو قیر چلی جاتی تو پھر فرصت ہی فرست تواب پھر ان کی مصروفیت کے دن تھے۔ اب کے مصروفیت زیادہ تھی کہ گھر میں شادی کا کھڑاگ پھیلا ہوا تھا۔ ذرا سستی دکھاتے تو تو قیر سے سخت و سست سنی پڑتی تھی۔ گھر میں جب سفیدی ہو رہی تھی تو تو قیر نے اندر باہر کے پھیرے لگا کے خود دیکھا کہ کام ٹھیک ہو رہا ہے۔ باہر کے حصے کا جائزہ لیتے لیتے وہ اس طرف بھی جانکلی جہاں نوکروں کے کوارٹر کے نام پر ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ کوٹھری کے اندر جھاناکا اور ٹھنڈک گئی۔ مشی جی کو آواز دی۔ مشی جی لپک کر آئے "بھی نیگم صاحبہ"

"مشی جی یہ کوٹھری کا حال بنا رکھا ہے۔ کب سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔ اتنے پیغمبر نے گودڑے۔" پھر ذرا را کر کر کسی قدر حیران ہو کر "ٹوپیاں اتنی ٹوپیاں۔ مشی جی یہ ٹوپیاں کیسی ہیں۔"

مشی جی تھوڑا اپٹائے۔ پھر بولے "بس وحیدا کا یہ خبط تھا۔ پتہ نہیں کس کس کی ٹوپی اڑا کر لایا تھا۔ پاگل نے ٹوپیوں کا ڈھیر لگادیا۔ پھر اچانک انہیں احساس ہوا کہ تو قیر پوچھنے گی کہ اس پاگل کو کس سے پوچھ کر گھر میں گھسایا تھا۔ سفوراً صفائی پیش کرنے پر اتر آئے۔" غریب کو کہیں سرچھانے کی جگہ نہیں تھی۔ اور اب کے جازا بھی ایسا پڑا کہ اللہ کی پناہ میں نے سوچا کہ باہر پڑا رہا تو ٹھنڈر کے رہ جائے گا۔ رات کو آ کر سوچا نے دو۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔" مگر مشی نے دیکھا کہ تو قیر کے یہاں کسی ہمدردی کے اثر آٹھار نہیں ہیں۔ سو

انہوں نے جلدی سے مضمون کو انتہا تک پہنچانے کی سوچی "مگر اس نے یہاں کون ساز یادہ وقت گزار ارات کو آ کر پڑ رہتا تھا۔ اور وہ بھی آیا۔ ایسا۔ ویسے بھی زیادہ عرصہ تو نہیں گزارا۔ بیچارہ مرہی گیا۔"  
"مر گیا؟" تو قیر تھوڑا غصہ ملکی۔

"ہاں مر گیا۔" مشی جی نے غصہ اس انس بھرا" رات کو کسی کسی وقت اس کے بنکار نے کی آواز آتی تھی۔ اس رات کوئی آواز نہیں آئی۔ صح ہوئی تو مرا پڑا تھا۔ بیچارہ۔"

ایسی گھری اندر سے بلا وہ آگیا کہ نہیں تائی بلا رہی ہیں نہیں تائی شادی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر ہاتھ بیماری تھیں تو قیر سنتے بڑھ رہی اور فوراً چل پڑی جاتے جاتے ہدایت کی تھوڑی نرمی کے ساتھ "چھپیا سے کہو کہ یاں آ کے جھاڑو دے۔ اور چونا اچھی طرح پھروں ایں۔" "جی بیگم صاحبہ۔"

تو قیر نے اوہر اندر قدم رکھا اوہر نہیں تائی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "اے بیٹی تو قیر میں پوچھوں ہوں کہ تمہارا کیسا انتظام ہے۔ کسی کو کسی بات کا کسی چیز کا پتہ ہی نہیں ہے۔ اسی بد انتظامی رہی تو میں بتائے دیتی ہوں وقت آنے پر تم بغلیں جھانکو گی اور برادری میں تھری تھری ہو جائے گی۔ بیٹی کی شادی ہے نہیں تھھھا تو نہیں ہے۔ بڑے انتظام کی ضرورت ہے۔ بیٹی والیاں کہنگی ماریاں بات کا بنگلہ بناتی ہیں۔"

"نہیں تائی، میرا اکیلا دم ہے۔ کیا کیا کروں۔ جس کام کون دیکھوں اسی میں کھنڈت پڑ جاتی ہے۔ قسم لے لو جو صبح سے ناشد کے نام منھ میں کھیل بھی گئی ہو۔ نہار منہ ایک نانگ پر پھر رہی ہوں۔"

"لبی بتم جانے کہاں پھر رہی ہو۔ میں یاں اپنی جان کو رو رہی ہوں۔ ابھنا ہوتا تو لڑکی کو ماں یوں بخادیتی۔ جس سے پوچھتی ہوں وہ لگا سا جواب دے دیتی ہے کہ میں تو پتہ نہیں ہے۔ ارے تمہیں پتہ نہیں ہے تو پھر کیا فرشتوں سے پتہ لیا جائے۔"

"ابھنا" تو قیر نے ایسے کہا جیسے ابٹنے کی بات اس کے ذہن سے اتر پھلی ہو اور اب نہیں تائی کے یاد دلانے پر یاد آئی ہو۔ "وہ تو میں نے مجیدن کے ذمے یہ کام لگایا تھا۔ مجیدن ہے کہاں؟"

"وہ تو مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔"

"ارے مجیدن کہاں ہے۔" تو قیر نے شور چانا شروع کیا۔

"ابھی نہیں آئی۔"

”کیوں نہیں آئی، گھر میں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟“ اور یہ کہتے کہتے تو قیر نے انور کی طرف دیکھا جو کرسی پر دراز اٹھینا سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ ابھی میں نے کہا کہ کچھ تم بھی تو ہاتھ پر ہلاو۔ یہ اخبار تو بعد میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔“

انور نے اخبار سے نظریں ہٹائیں۔ ”کیا مسئلہ ہے۔“

”مسئلہ بعد میں سمجھتے رہنا۔“ تو قیر بولی ”ذرما نشی جی کو مجیدن کی طرف بھجو۔ کہو کہ مجیدن سے جا کے کہیں کہ اپنالے کے فوراً آئے۔ ابھی اسی وقت۔“

انور نے عینک اتار کر کیس میں رکھی۔ اخبار کو ایک طرف رکھا۔ اور باہر کل کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں واپس آیا ”نشی جی ادھر جا رہے ہیں۔ ابھی اسے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر اخبار اٹھاتے اٹھاتے سمجھی تائی سے مخاطب ہوا ”مگر نشی تائی ماں یوں کے سلسلہ میں اتنی کیوں ٹلات ہے۔ کیوں غریب کو ابھی سے باندھ کر بٹھاتی ہو۔“

”اے لو، تو قیر سن رہی ہو۔ یہ تمہارے دلوہا کیا کہہ رہے ہیں تو قیر کو متوجہ کر کے فوراً انور سے مخاطب ہو گیں ”انور میاں، تم اس زمانے کے آدمی ہونا۔ ارے ہمارے زمانے میں تو پندرہ پندرہ دن پہلے لڑکی ماں یوں بھادی جاتی تھی اس طرح کے مجال ہے آسمان دیکھ جائے۔ اتنا اپنالا جاتا تھا کہ سارے کپڑے پیلے ہلدی ہو جاتے تھے۔ اور جب دہن بنتی تھی تو مہکتی تھی۔ آج کل کی طرح تھوڑا ہی کہ ٹگور یوں نے وقت کے وقت کی فیشن کی دکان پر جا کے بناو سگھار کروایا اور دہن بن کے بیٹھ گئیں۔“

اجی سمجھی تائی تو قیر بولی تم ان کی باتوں پر مت جاؤ۔ انہیں ریت رسماں کا کیا۔

”گھر میں ماش اللہ پہلی شادی ہے تا۔ بس اس کے ساتھ سب پتہ چل جائے گا۔“

سمجھی تائی کا بیان جاری تھا کہ تو قیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اچانک خیال آیا کہ دیکھنا چاہیے کہ جوڑے کتنے بیک گئے ہیں اور کتنے ابھی نہ کنے باقی ہیں۔ وہ لپک جھپک اس کمرے میں پہنچی جہاں جوڑے نائلے کے جا رہے تھے۔ جائزہ لیا ہدایات دیں اور پھر فوراً وہاں سے نکل باور پیچی خانے کا رخ کیا۔ مہماں کچھ آن پہنچے تھے، کچھ کہہ برادری کی بیباں جو تیار یوں میں ہاتھ بٹانے کے بھانے صح سے رات تک بیباں اکٹھی رہتی تھیں۔ سودستخوان اچھا خاصا پھیل گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ باور پیچی خانے نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی۔ غرضیکہ تو قیر کی جان کے لئے سودھنے تھے۔ اور آج تو وہ واقعی ایک ناگنگ پر بھر رہی تھی۔ ایک ناگنگ بیباں ایک ناگنگ دہاں۔ کہیں رات گئے اسے کر لگانے کی مہلت میر آئی۔ اتنی تھی ہوئی تھی کہ لینے ہی سو گئی۔

لگتا ہیں تھا کہ گھوڑے پیچ کر سوئے گی اور صح سیک سنائے گی مگر اس کی تو پیچ رات ہی آنکھ کھل گئی اور اس طرح کھلی کہ آنکھوں سے

نیند ہی غائب ہو گئی۔ جانے کون سا پھر تھا شاید کہیں دور سے مرغے کی بانگ سنائی دے۔ اس کا اندازہ غلط نکلا۔ نہ مرغے کی بانگ نہ کسی کی کھانس کھنکا۔ گھر میں سب چھٹے ہارے گھوڑے بیچ کے سوئے ہوئے تھے۔ سنائے اور اندر چیرے میں ذہن زندگی بھر کہیں سے کہیں نکل گیا ان دونوں جب ابھی وہ لڑکی باالی تھی اور خاندان کے ہر بالغ ہوتے لڑکے سے پردہ کرتی تھی۔ ادھر کوئی آیا ادھر وہ بچلی کی سی تیزی سے کمرے کے اندر۔ پھر وہ کنوائر وہ کی دراڑ سے آنے والے کو تھوڑا دیکھتی اور تجسس ختم ہو جانے پر پھر اپنا کروشیا چلانے میں منہمک ہو جاتی۔ وحید کو بھی پہلی مرتبہ اس نے کنوائر وہ کی دراڑ ہی میں سے دیکھا تھا۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک خوش شکل نوجوان اس کے تصور میں پھر گیا۔ ”یہ وحید ہے“ وہ اسے دیکھ کر کتنی حیران ہوئی تھی۔ تھا بھی تو وہ خاندان کے باقی لڑکوں سے بالکل مختلف، چال ڈھال میں تعلیم میں۔ نیازیابی۔ اے کر کے آیا تھا۔ پر دیس سے اس کی ماں تو خاندان میں ہونے والی شادی ٹھی کی تقریب میں آتی رہتی تھی۔ وہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر کیوں آتا۔ اب کے ماں اسے خاص طور پر ساتھ لے کر آئی تھی کہ پورا کنبہ دیکھ لے کہ اس کا لال بڑا ہو گیا ہے اور اس نے بی۔ کر لیا ہے۔

”جیتے رہو جیئے“ اس کی ماں نے وحید کے سلام کے جواب میں کتنی دعا کیں دی تھیں۔ ”افسر بنو۔ چاندی دہن بیاہ کے لااؤ۔ ماں باپ بھاریں دیکھیں۔“  
اس دعا پر اس کا دل کتنا دھڑکا تھا اور کتنی دیر تک وہ کنوائر کی دراڑ پر آنکھ چپکائے کھڑی رہی تھی۔ چاند سا اس کا دواہا۔

میرا	چھٹک	منک	آیا	بڑا	ری
بڑی	دوروں	سے	آیا	بڑا	ری

کب کی بھولی بسری دبی دیا گئی آواز کہاں سے ابھری اور اس پر چھاتی چلی گئی۔ پھر اس کا لوٹھ بدن پلٹک پر تھا اور وہ کہاں کہاں پہنچی ہوئی تھی۔ بھرا گھر زرق برق پوشاکوں میں گہنے پاتے سے لدمی پھندی پیہیاں۔ آوازے قہقہے بھانت بھانت کی بولی۔ اے بی ڈیورھی پہنچو دلہباں آنے کو ہے۔ ارے آخر کب آئے گا اے لوہ تو وہ آرہا ہے۔ پیہیو دلہا اندر آیا ہے۔ ڈوہینوں نے جھٹ ڈھوکلی سنچاہی۔

میرا	چھٹک	منک	آیا	بڑا	ری
بڑی	دوروں	سے	آیا	بڑا	ری

اے بی قرآن پیچ میں دھرو۔ کہاں سے دھروں رحل تو ہے ہی نہیں..... کہو میاں نوشہ بی بی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام.....”  
”بی بی آنکھیں کھولو۔ میں تمہارا غلام۔“  
”آنکھیں کھولیں۔؟“  
”کھول دیں۔“

”جھوٹ۔ نہیں کھولیں۔ تو قیر، آنکھیں مت کھولیو۔“

”وحید میاں، ہم تمہیں لہن کو ایسے تو نہیں لے جانے دیں گے۔ ساتھ دفعہ غلامی کا دم بھرو۔“

بی بی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام۔ بی بی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام۔ بی بی لکڑوں کوں۔ دورا سے مر نئے باگ سنائی دی۔ تو قیر ہزردا کر لیئے سے بیٹھ گئی۔ اوہرا اوہر دیکھا۔ اندھیرا۔ انور بے خبر پڑا خڑائے لے رہا تھا۔ بے سدھ بیٹھی رہی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ نیندا آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پھر راذان کی آواز آئی۔ نماز کا وقت آیا۔ ہزردا اُنی اور پنگ سے اتر کر باتحروم کی طرف گئی۔ باتحومند دھوکے وضو کر کے واپس آئی اور چوکی پر جانماز بچھا کے نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔ کتنے زمانے بعد آج صحیح وقت پر صبح کی نماز پڑھ رہی تھی۔ فرض کے بعد دیر تک صحیح پھیرتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، سجدہ کیا اور جانماز پیٹ کر رکھوی۔ اب کیا کرے۔ ابھی پورا جالا نہیں ہوا تھا اور کوئی ابھی تک نہیں جا گا تھا۔ چوکی پر بیٹھے بیٹھے پانداں قریب سر کایا۔ ایک کتر لگا کر منہ میں رکھی اور چھالیا کترنی شروع کر دی۔ خیالوں میں گم بیٹھی رہی ہاتھ میں سروطہ چلتا رہا۔ پہلا دورہ کب پڑا تھا، بس یونہی ایک خیال سا آیا مگر شاید اس کی مرضی کے خلاف کہ فوراً ہی رفع دفع ہو گیا۔ اور پھر وہی تصور..... سوت بوت میں ملبوس نہ ملکھ، کتنا اچھا لگ رہا تھا، کتنا کھل رہا تھا اس لباس میں۔ ماش اللہ چاند ساد و لہما ملا۔ بی بی تمہارا وحید مقابلہ کے امتحان میں اول آیا ہے.....

”ارے، آج تم اتنی سورے اٹھ بیٹھیں۔“ انور جاگ اٹھا تھا اور اس کے ساتھ اس کے تصور کی لڑی مرتب ہوتے ہو تے پھر بھر گئی انور آنکھیں ملتا ہوا فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو قیر کو بیخاد لیکھ کر اسے تجھب ہو رہا تھا ”تم رات سوئی بھی تھیں یا نہیں۔ جب تک میں جا گتا رہوں اس وقت تک تو تم آئی نہیں تھی۔ پتہ نہیں کتنی رات کو آ کر لیت گئیں اور پھر اتنی سورے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سوئی بھی تھیں یا نہیں۔“

تو قیر نے بغیر جواب دیئے اتنی بیگانگی کے ساتھ اسے دیکھا جیسے کوئی غیر مرد اس کی خلوت میں آن دھرم کا ہوا رز بر دتی اس سے مخاطب ہو۔ پھر سروطہ اور چھالیاں سنگھوا کر پانداں باند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے چلتے بے تعلقی سے انور کو دیکھتے ہوئے کہا ”تم سوو۔“

اور کمرے سے نکل گئی۔

صحن میں خاموشی تھی اور نیکلی میں رچا دھندا کا۔ صرف منڈیر پر زندگی کے آثار تھے جہاں ایک جنگلی کبوتر اور کبوتری گلک رہے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ پر چوکے گردان گھما کر دیکھا اور پھر پھر اکراڑا گئے۔ اس نے برآمدے میں سوتے ہوؤں کو ایک بے تعلقی سے دیکھا اور صحن کو عبور کر کے مردانے میں نکل گئی۔

مردانے میں خاموشی ہی تھی سوائے اس کے کہ سامنے والے نیم کی ٹھینیوں میں چپھی چڑیاں بہت شور کر رہی تھیں مگر اس کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ پھر وہ اسی کوھڑی کے سامنے کھڑی تھی کل جس کا نقشہ اب تر دیکھ کر گئی تھی۔ اب نقشہ اور رخاؤ پیوں کی ڈھیری چیزیں کھڑے گودڑے پہنچنے پر آنے جوتے دیواروں پر لگے جائے کوئلوں سے بنی کیلا کانٹی، اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جھاڑو دل گئی تھی اور دیواروں پر سفیدی ہو چکی تھی۔ ایک بلی کونے میں دکی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر پھریری لی اور تیزی سے اس کے برابر سے نکل باہر سنک گئی۔ ”بیگم صاب“ سفیدی ہونے کے بعد کمرے کی شکل نکل آئی۔ ”مشی جی چیچے کھڑے کھڑے بولے۔ وہ ایسی بے خبر کھڑی تھی کہ اسے پڑھی نہ چلا کہ وہ کس وقت اس کے چیچے آ کھڑے ہوئے تھے“ ”بیگم صاب“ میں نے توکل دیکھا۔ اس دیوانے نے کتنا کباڑ جمع کر رکھا تھا۔ چھیا کوفر ابلا یا اور جھاڑو دلوائی سفیدی کے دو کوٹ ہو گئے ہیں۔ ایک کوٹ ابھی ہونا ہے“ ”مشی جی بولے جارہے تھے اور وہ گم سم کھڑی تھی۔ ذرا جو ہنکار اپھر ہو۔ جیسے کچھ نہ سنا ہو۔ کل یہاں کوڑا کر کت دیکھ کر دل برآ ہوا تھا۔ آج سفیدی اور صفائی دیکھ کر جی اداسی سے بھر گیا۔ سختی رہی۔ پھر پہنچی اس طور کہ ہر قدم پر لگ رہا تھا کہ وہ ڈھینے لگی ہے نیم کی ٹھینیوں میں خاموشی تھی جیسے سب چڑیاں اڑ گئی ہوں۔ وہوپ مری مری اسی منڈیر پر پھیلے گئی تھی۔



# تذکرہ ستحیرہ بے جا المعروف بہ فسانہ عبرت

مدت مید سے کترین کی یہ آرزو تھی کہ زمانہ ستحیرہ بے جا کے حالات و کوائف بعد تحقیق کے نیجا کئے جائیں اور ایک مرقع عبرت اہل بنیش کے لئے تیار کیا جاوے۔ احباب نے اس کام کو کار عبث بتایا۔ کہا کہ وہ دور مانند حرف غلط کے تھا کہ مت گیا۔ تم غلط کو صحیح کیسے کرو گے اور جس کے سارے نشان مت چکے ہوں اسے اجاگر کیسے کرو گے پھر دور تو اور بھی ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ اسی دور کو اجاگر کیا جاوے جس میں اجاگر کرنے کی کوئی بات نہ ہو۔ آخر وہاں فخر کرنے کی کوئی جائے ہے۔ مگر بندہ اس دلیل سے قائل نہ ہوا۔ اتنا نہیں قابل کرنے کی سمجھی کی کہ عزیز و اور پچھنچیں تو ہم اس دور کو اپنی تاریخ کے ایک عجوبے کے طور پر یاد رکھ سکتے ہیں اور آدمی اپنی تاریخ کے عجوبوں سے کیوں شرمادے کیوں نہ ان سے عبرت حاصل کرے۔ ایسا کہہ کر اور یوں سوچ کر اس بے ہمت نے کر ہمت کی اور اس دور کا تذکرہ لکھنے پر مستعد ہوا جس کا احوال سن کر صاحب دل گاہ ہنتے ہیں گا روئے ہیں۔

اس پیچے مدار کو اپنے کام میں بڑی مشکل یوں پیش آئی کہ اس دور کے تذکرے علی العلوم ناپید ہیں۔ اکادمیاتیاب ہو تو اردو میں تھا۔ اردو ایک زبان تھی جو دنیس سے باعیں لکھی جاتی تھی۔ اہل تحقیق شہر قدیم کی کھدائی سے پہلے ہی ایسی زبان کے موجود ہونے کا امکان ظاہر کر چکے تھے۔ مگر بوجہ شخص شواہد مہیا نہ ہونے کے وثوق سے اس کے بارے میں بات کرنے سے قادر ہے۔ کھدائی کے بعد گزرے زمانے میں موجود اور مروج ہونا اس کا مسلم نہ ہوا۔ اس کھدائی میں اول ایسی اینٹیں برآمد ہوئیں جن پر یہ زبان لکھنے کا پائی گئی۔ یہ اینٹیں موجود اردو اور ہر پر سے برآمد ہونے والی اینٹوں سے مختلف ہیں۔ ساخت کے اعتبار سے بھی اور استعمال کے اعتبار سے بھی۔ یہ اینٹیں اپنے زمانے میں دونوں کاموں کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ بنانے کے لئے بھی، توڑنے کے لئے بھی۔ ان سے بھی۔ یہ اینٹیں اپنے زمانے میں دنوں کاموں کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ کاروں کے شیشے چکنا چور کر کے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ البتہ بسوں کو بعد اس کے جلا دیا جاتا تھا مگر ان اینٹوں کا شاہکار ڈیڑھائیںٹ کی مسجد تھی۔ اس طرز میں عمارت اس طور کھڑی کی جاتی تھی کہ دیکھتے دیکھتے اینٹ سے اینٹ نجح جاتی تھی۔ پھر نہ اینٹ رہتی تھی نہ اینٹ والے رہتے تھے۔

بعد اینٹوں کی برآمد کے مزید کھدائی پر مخطوطات، ملفوظات، مطبوعات کے دفتر کے دفتر برآمد ہوئے کہ یہ شہر کسی زمانے میں کتب

خانوں درسگا ہوں اور چھاپے خانوں کا مرکز تھا۔ ان دفتروں کو دیکھ کر محققوں نے اپنے اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور دور کی کوڑی لائے۔ پہلے اس شہر کے محل وقوع کا اندازہ لگایا۔ جہاں اب یہ شہر آباد ہے آگے یہاں گھننا جنگل تھا جہاں قافلے دن دیہاڑے لٹھ جاتے تھے کہ یہ ڈاکوؤں کی آماجگاہ تھا مگر پھر اس جنگل کی قید نہیں رہی۔ شہر کے پیش اشراف لئے لگے ڈاکوؤں دیہاڑے پھرے بازاروں میں غمودار ہوتے۔ صرافوں بزازوں کو ہزاریوں بزاریوں کو اس رنگ سے لوٹتے کہ بس تن پہ کپڑے باقی رہ جاتے۔ ٹھوں ٹھاں کرتے ہوئے بیکوں مال خانوں میں داخل ہوتے اور تجویر یاں خالی کر کے بصد اطمینان واپس جاتے۔ تو خیر شہر وہاں آباد تھا جہاں اب ویرانہ ہے اور جہاں تھاں تھوڑے اثر آثار ہیں۔ مخطوطات، مخطوطات، مطبوعات کے دفتر جو برآمد ہوئے ان کی زبان عجیب تھی۔ محققوں نے اس زبان کا سراغ لگایا اور ثابت کیا کہ یہ وہی زبان اردو ہے جو کسی بھلے یا برسے وقت میں اس ملک کی قومی زبان قرار پائی تھی یا قرار پاتے پاتے رہ گئی تھی۔ چونکہ زمانہ رستمیز بے جا میں ہروہ شے جو قومی قرار پائی تھی پہلے رسوا ہوئی پھر کا عدم ہو گئی سو یہ زبان بھی آگے مقبول و موقر تھی زبان کے ٹھپے کے ساتھ پہلے رسوا ہوئی پھر معدوم ہو گئی۔ محققوں کا دوسرا اگر وہ اس خیال کا حامی ہے کہ یہ زبان قومی نہیں تھی۔ صرف رابطہ کی زبان تھی مگر چونکہ رستمیز بجا کے ہنگام قبیلے اور علاقوں یہ کہتے تھے کہ رابطہ چکتی ست کہ پیش مرداں می آیا اس لئے مرداں بلند ہمت نے رابطہ کی دوسری صورتوں کے ساتھ اس صورت کو بھی دفع کیا اور رابطہ کے سب جھمیلوں سے آزاد ہو گئے۔

خیر تو میرے لئے لازم آیا کہ کسی نہ کسی طور اس زبان سے شناسائی حاصل کروں، مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکہ اس کا عدم زبان میں ورک حاصل کروں۔ جو سندھ پاکنڈہ، گھومتے پھرتے میری ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی جس کے جدا مجد اپنے وقت کے نامی گرامی پتواری تھے اور اس بستی کے مکین تھے جس کا نام کتب قدیم میں لا لوکھیت لکھا ہے۔ اس بزرگ کو میں نے اس زبان سے آشنا پایا تو گویا گوہ مراد ہاتھ آیا۔ ہاتھ پیر توڑ کے دنیا جہان سے منہ موڑ کے ان کی چوکھت پر بیٹھ گیا۔ اول اول اس بزرگ نے بہت ناہ نوہ کی۔ عذر یوں کیا کہ یہ ہمارا خاندانی راز ہے جسے افشا کرنے کی اجازت نہیں خاندان میں بھی صرف بزرگ خاندان کے پاس یہ علم بطور امانت ہوتا ہے، جب وہ مر نے لگتا ہے تو وارث کو پاس بلاتا ہے، کان میں کچھ بھونکتا ہے، سینہ سے سینہ ملاتا ہے اور پھر آنکھ ہند کر لیتا ہے۔ اس طور اردو کا گنجینہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا مجھ تک پہنچا ہے۔ اب خاندان میں جو مستحق ہے اسے دم آخ منتقل کروں گا۔ تجھ پر کہ غیر ہے کیے اسے افشا کروں مگر یہ خاکسار بھی ڈھیٹ لکلا۔ چوکھ اس کی نچھوڑی۔ جھبڑ کیاں کھائیں، چلیں بھریں پرواں سے نٹلا۔ آخر کے تینیں اس بزرگ کا دل پیسجا۔ سوچا کہ سائل کا جذبہ صادق ہے۔ اسے خالی ہاتھ واپس بھیجننا آئین مروت کے خلاف ہے۔

سوچار حرف اردو کے اس نے مجھے سکھائے کہ سینہ میرا اس علم سے معمور ہوا۔ پھر اس بزرگ سے اس گز رے زمانے کی تھوڑی باتیں اس طرح سنیں جس طور اس نے اپنے جد سے اس جد نے اپنے جد سے سنی تھیں۔ پھر ان تذکروں کو کہہ دیں میں برآمد ہوئے تھے کھنگالا۔ الحمد للہ کہ بعد تحقیق و تدقیق کے اب اس قابل ہوا ہوں کہ اس زمانے کے حالات جست جست بیان کروں اور بتاؤں کہ کیسا کیا شخص قصر گناہی میں گم ہوا۔

اس زمانے کے حالات عجیب اور اشخاص غریب ہیں۔ اشیاء ایسی ایسی کہ لاکھ شواہدان کے ہونے کے آج پیش کئے جائیں سننے والے کو مطلق تھیں ان کے ہونے کا نہ آؤے۔ اے عزیز و کیا تم باور کرو گے کہ اس زمانے میں ایسے پھول پائے جاتے تھے جن سے خوبصورتی تھی۔ مجملہ ان کے ایک پھول تھا جسے چنبلی کہا جاتا تھا۔ کیا اجل اجل مہکتا پھول تھا۔ مگر ہوا یہ کہ اسے قومی پھول فرار دیدیا گیا۔ بس پھر گلشن گلشن رسوہ اور معدوم ہو گیا۔ اسی قبل سے ایک پھول تھا جسے تذکرہ نویسوں نے موتیا لکھا ہے اس کے نصیب اچھے تھے کہ قومی پھول نہیں تھا۔ سو وہ ایک زمانے تک پھولتا رہا۔ اس پھول کا مہکنا محققوں کی نظر میں ثابت ہے۔ مگر یہ بھی تحقیق طلب ہے کہ رنگ اس کا کیا تھا۔ تذکرہ نگاروں نے رنگ کا اس کے ذکر نہیں کیا مگر یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے خوبی کی لپیٹ تھیں اور عورتیں اس کے گھرے بن کر اپنے جوڑے میں گوندھتی تھیں۔ جوڑا کیا ہوتا ہے اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ جوڑا چوٹیا، دوپٹہ یا اشیاء تفصیل طلب ہیں۔ میں سرسری اتنا بیان کروں گا کہ اس زمانے میں عورتوں کو عجیب شوق تھا کہ سر کے بال نہیں ترشوائی تھیں۔ سر کے بالوں کو اگر لپیٹ لیا جاتا تو وہ جوڑا کہلاتا اگر ابیت دے کر پیچھے ڈال لیا جاتا تو اسے چوٹیا کہا جاتا۔ پرانے تذکروں میں ایسی عورتوں کی تصویریں علی العلوم نظر آتی ہیں۔ لاوکیتی بزرگ نے بیان کیا کہ اس نے اپنے جد سے ساک انہوں نے اپنی آنکھ سے ایسی عورت کو دیکھا تھا جس کے بال اتنے لمبے تھے کہ اس نے انہیں بٹ کر اور پیچ اس کے ایک پھندنا پھنسا کر کرپہ ڈال لیا تھا۔ ویزی یہ کہ اس نے ایک غایت بار یک کپڑا سینے پاں دھنگ سے ڈال رکھا تھا کہ ان دو چاندوں کو چار چاند لگ کر گئے تھے۔ انہمہم کی کپڑا دوپٹہ کہلاتا تھا۔

میں نے سطور بالا میں لاوکیتی کے بزرگ کو پنواری لکھا ہے۔ پنواری سے بھی سرسری تعارف لازم ہے کہ اس عہد کی معاشرت کے غریب رنگوں سے بھی ہماری شناسائی ہو جاوے۔ میری تحقیق یہ کہتی ہے کہ پنورا ای پان بیچنے والے کو کہا جاتا تھا۔ اور یہ پان کیا ہے اس پر میری تحقیق ابھی جاری ہے۔ اطلاعے قدمی نے بے شمار جزوی بولیوں کا ذکر کیا ہے جن کے اپنے اپنے خصائص ہیں۔ مگر اس بولی کے خصائص مجرما العقول ہیں جنہیں قلمبند کرنے کے لئے ایک رسالہ و رکارہے بعد تحقیق کے ان سب خصائص کو حیطہ تحریر میں لاوں گا۔ سردست یوں جائیے کہ یہ ایک قسم کا پتا تھا جو ایک سو ایک مسالوں میں لپیٹ کر کھایا جاتا تھا۔ اس کے کھاتے ہی زبان طوطے کی

چونچ کی مثال لال اور طبع غزل میں رواں ہو جاتی تھی۔ سوجو پان کھاتا تھا وہ ادبد اکر غزل بھی کہتا تھا۔ اور جو غزل کہتا تھا وہ پان بھی کھاتا تھا۔ گویا کہ پان کو غزل سے مفرنسیس تھا اور غزل طبع رواں سے زیادہ پان کی شرمندہ احسان تھی۔ پان اب عنقا ہے اور غزل کو نایاب ہے۔ دونوں ہی کو یوں سمجھو کر زمانے کی بکری چر گئی۔ اس لئے آج کے لوگوں کو یہ بتانا پڑتا ہے اگرچہ بتانے پر بھی وہ نہیں سمجھتے کہ پان کیا نعمت تھی اور غزل کو کیا شے تھا مگر اس زمانے میں دونوں کی افراط تھی۔ پنورا ای کوچ کوچ غزل گومونج مون، اور لا لوکھیت تو غزل گویوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس دور کے ترچھے بانکو کے بیچ وہ بھی اپنے آپ کو پانچویں سواروں میں جانتے تھے۔ مگر ان کی رانوں کے بیچ سے گھوڑا انکل گیا تھا۔ اس باعث انہوں نے پانچویں سوار کو بخسن و خوبی نئی لغت میں ترجمہ کیا اور اپنے آپ کو پانچویں قومیت کہنے لگے۔ بس پھر چل سوچل۔ بفضلہ تعالیٰ قومیت سے قومیت پیدا ہوتی چلی گئی۔

اس تذکرے کے سلسلہ میں جو مرحلہ میں نے طے کئے ان میں سب سے سخت مرحلہ یہی غزل کا ہے۔ بندہ کوتاہ قلم ہے اور غزل گویوں کی ایک فوج ظفر مونج ہے پھر اور بھی تو رنگ رنگ کے شاعر ہیں جنہوں نے مضامین نو کے انبار لگائے ہیں۔ ان پر مستزاد نشناگار کے طرح کی نہ لکھی ہے اور گلشن قرطاس میں رنگ رنگ کے گل پھول کھلائے ہیں۔ کیونکہ یہ دریا اس تذکرے کے کوزے میں بند ہو پاوے گا۔ مگر ہمت مرداں مدد خدا۔ یہی سوچ کر کرہتے باندھی ہے اور تذکرے پر جست گیا ہوں۔

اس صانع حقیقی کی صفت کے کیا کہنے کہ اتنی خلاقت پیدا کی مگر کیا مجال کہ کوئی ایک چہرہ دوسرا چہرے سے مل جاوے۔ یہی کیفیت اس عہد کے غزل گویوں کی تھی۔ غزل سب ایک سی لکھتے تھے مگر انکے سب کی الگ الگ تھی۔ رنگ رنگ کے پیچھی تھے بھانت بھانت کی بولی بولتے تھے۔ ہاں ایک نعرہ مشترک تھا۔ یہ کہ ادیب کو جابر حاکم کے رو بر کلمہ حق کہتا چاہیے مگر بقول احمد مشکوں یہی شے انکے کلام میں عنقا تھی۔ احمد مشکوں اپنی طرز کے شاعر تھے۔ ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جواب ناپید ہے۔

فقیر نے اس تذکرے کے لئے بہت کتب خانے چھانے۔ کہیں دستیاب نہ ہوا۔ اگر وہ بھی دستیاب ہو گیا تو اس زمانے کے سب ادیبوں کے چہرے بے ناقاب ہو جائیں گے۔ بس ان کے کچھ اقوال جستہ جستہ ہم تک پہنچے ہیں۔ حالات زندگی جو میں تحقیق کر سکا ہوں یہ ہیں کہ اصلًا لکھنؤی تھے مگر پیدا ہوئے امر تسریں۔ بھرت کر کے لا ہور پہنچ اور جہاں بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے۔ ایک چائے خانہ کے عہد قدیم کی یاد گار تھا۔ ان کا سکھیے تھا۔ دن رات وہیں بیٹھے رہتے کبھی کبھی رنگ آسمان دیکھنے کی نیت سے باہر آتے اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جاتے۔ سرمایہ داروں افسروں اور ان کے کاس لیس ادیبوں کو مورشوں کو فرائی سے گزرتا دیکھتے۔ بس جلال میں آجائے اور سکنے میں واپس آکر چائے پیتے۔ غزل لکھتے لکھتے جوش حق گوئی میں نشر میں رواں ہو گئے ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا جس میں عہد

کے سارے منافق دانشوروں کا کہ سب ان کی تحقیق کے مطابق ہی آئی اے کے ایجنت تھے۔ احوال لکھا تھا۔ اصل میں وہ پچھے ہوئے بزرگ تھے۔ اپنے کشف سے بد باطنوں کے باطن کو جان لیتے تھے اور چہرہ دیکھ کر نیت کا حال دریافت کر لیتے تھے۔ قوم کا احوال دیکھ کر گریہ کتاب رہتے تھے اور افسوس کیا کیا کرتے تھے کہ وائے ہوان لوگوں پر کہ امریکہ کے دام تذویر میں گرفتار ہیں۔ افسوس کرتے کرتے ایک روز جلال آیا کہ گھر کو پھونک ڈالا جب گھر کی ایک ایک چیز جل گئی دامن جھاڑ کر خاک سے اٹھے۔ بیوی بچوں کو ساتھ لے چل کھڑے ہوئے۔ اہل محلہ نے پوچھا کہ ہر جاتے ہو۔ جواب دیا جہاں پوری قوم جا کر پیشانی نیکتی ہے۔ سوچا ہے کہ اسی سنگ آستان سے جا کر سر پھوڑیں۔ یہ کہہ بستی سے کنارہ کیا اور نیو یارک کے زجن بن میں جا کر روپوش ہو گئے۔

احمد مشکوک کو استاد منصور سے تلمذ حاصل تھا۔ استاد منصور خوب بزرگ تھے۔ کبوتر بازی میں طاق غزل گوئی میں مشاق۔ کبوتر ان کی مٹھی سے نکل کر تارہ بن جاتا تھا، شعر ہونٹوں سے نکل کر دل میں ترازو ہو جاتا تھا۔ ہر دو فنوں میں چوٹی کے استاد لوہا ان کا مانتے تھے، مقابلہ میں آنے سے کتراتے تھے مگر خوبی تقدیر سے یوں ہوا کہ کبوتروں کو ٹوٹی چاٹ گئی، غزاں کا دیوان چوری ہو گیا۔ اس دہری چوٹ سے جانبرہ ہو سکے۔ دنیا سے اس طور رخصت ہوئے کہ ترک میں نہ کوئی کبوتر چھوڑ ان شعر۔

وہ زمانہ عجب تھا۔ سب ایک دوسرے سے لارہے تھے۔ فرقہ فرقے سے علاقہ علاقے سے بھائی بھائی سے شاعر شاعر سے۔ کینہ پروری اور تہمت طرازی کا دور دورہ تھا۔ بھائی چارے کا فقدان تھا، بردار کشی ہر قصے کا عنوان تھا۔ دو بزرگ کہ اپنے زمانے کے بکر اور تغلب تھے۔ دونوں کے اپنے ندائی تھے جو پچاس برس تک دونوں کے درمیان صف آرائی رہی۔ قلم چلتے رہے اس شان سے کفر یقین نے لکھ لکھ کر کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ شدید علی دوست الاشد الموت۔ ان کی تواریخی نیام میں نہیں گئی اور قلم کبھی رکانیں۔ تکوار سے خون اور قلم سے روشنائی پیکتی رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ سوچاتے تھے تب بھی ان کا قلم چلتا رہتا تھا۔ سو بہت سے مضامین سوتے میں لکھے گئے مگرایے کہ ہر مضمون نے ڈشتوں کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔

اصل میں اس زمانے میں پیری مریدی کا بہت چکر تھا۔ سب سے بڑھ کر پیر شاہی تھے جن سے سلسلہ شاہیہ یادگار ہے۔ اہل منصب میں سے تھے۔ اس دور کی بساط پر شاہ آتے رہے مات کھاتے رہے۔ مگر انہوں نے مات نہیں کھائی، ترقی کے زینے پر چڑھتے چلے گئے مگر پھر منصب سے جی پھر گیا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے خفتان ہوا۔ بو لے کہ عزیز و ہم چلے۔ یہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ بس کھڑاؤں ان کے رکھے رہ گئے۔ حالیہ رسول کی کھدائی میں ایک باور پی خانہ برآمد ہوا ہے جس میں دو کھڑاؤں بہت سے اُلی وی سیریل کے مسودے اور ایک توامی میں دبا پایا گیا۔ قرآن بتاتے ہیں کہ یہ وہی باور پی خانہ ہے جس میں بیٹھ کر ہما بانو ہند یا پاکتی تھیں اور ڈرامے

لکھتی تھیں۔ جتنی دیر میں ہند یاد میں آتی اتنی دیر میں ایک ڈرامہ مکمل ہو جاتا۔ یہ سب پیر شابی کے کھڑاؤں کی برکت تھی جو چوپے کے برابر بنے طاق میں سج رکھے رہتے تھے۔ توے کے متعلق جاننا چاہیے کہ اول اول اس پر وہ چیز پاکی جاتی تھی جسے اس زمانے میں چپاتی کہتے تھے۔ جب خدر پڑا تو اسے سر پہ باندھا جانے لگا۔

منشی صفائی اسی سلسلہ میں شابی سے ملک تھے۔ اوائل عمر میں فرانڈ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ کتنے زمانے تک جنسی نفیات کی بے برکت وادی میں بھکتی پھرے۔ ایک دفعہ پیر شابی کی قدموں کا شرف حاصل ہوا۔ پھر اس چوکھٹ کونہ چھوڑا۔ وہیں دھرنہ مار کر بیٹھ گئے۔ یہ سوچ کر کہ جو مانا ہے تبیں سے ملے گا۔ پیر کے غائب ہو جانے کے بعد کتنے دن حالت ام میں رہے۔ ایک روز خواب میں ہدایت ہوئی تو انھ کر فوراً ہی قلم ہاتھ میں پکڑا اور ایک رسالہ لکھا۔ الامفوظات شابیہ اس کا نام رکھا۔ پیر صاحب کی کرامات باتفصیل اس میں قلمبند کیں پھر ایک روز جلال آیا تو داستان امیر حمزہ اس کے سامنے گرد ہو گئی اب نایاب ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب خدر میں ناخواروں اور بدمندوں نے ان کے گھر کو آگ لگائی تو جہاں سب کچھ جلا یہ داستان بھی جل گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ داستان تین دن تین رات مستقل جلتی رہی۔

لیقین کا نہ حلہ بانو کے شوہر تھے۔ جوانی کے قبیلی سال افسانے لکھنے میں صائم کے۔ ہوش آنے پر اس کا رعب سے توبہ کی اور تبلیغی لٹری پروڈیوں کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا روبار میں برکت دی۔ ان کے تیار کردہ رسالوں کی مانگ بڑھتی چلی گئی۔ پیر شابی سے بیعت تھے اور فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خلقت سمجھتی رہی کہ یہ شخص سگ دنیا ہے۔ انہوں نے اس پر دے میں سلوک کی منزلیں طے کیں اور سینہ نور عرفان سے بھر لیا۔ مگر بعض محققوں نے شک ظاہر کیا ہے کہ ان کا علم غفلی علم تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک تھے گنام سرقدی مردے بودا زسر قد نغل کہنا اور گریہ کرنا۔ ایک روز روتے شہر سے لگلے اور کربلاؑ معلی کی طرف چل پڑے۔ مگر قدم بیکے اور وہ لندن کے دشت حیرت میں جانکلے۔ حوریان فرنگ کو دیکھ کر ہوش کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ ایک حور شماں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بس قیامت آئی ایک فیل پیکر دیو سیاہ نمودار ہوا۔ ایسا دھکا دیا کہ آنکھ مکھی تو اپنے آپ کو اپنی بستی میں اپنے خانہ ویراں میں پڑا پایا۔ آہ سر دکھنچتے تھے اور کہتے تھے ایک دفعہ دیکھا ہے دوسری دفعہ دیکھنے کی آرزو ہے۔ آدمی عمر گریہ میں بسر کی۔ باقی آدمی عمر ٹھنڈی آہیں بھرنے میں صرف کی۔

انہیں کے ایک ہم عصر اور عزیز دوست تھے قلندر فلکی ماہر فلکیات تھے و نیز شاعر۔ زندگی میں ایک ہی آرزو رکھتے تھے کہ کسی ایسے

کو دیکھیں ہے وہ مسلمان کہہ سکیں۔ گنام سرقندی کے حال پر افسوس کیا کرتے تھے کہ ایک دوست ملا وہ بھی ایسا کہ شیوه اس کا فرض ہے کل کاں کو غیر مسلم اتفاقیت قرار دے دیا گیا تو اس کی نماز جنازہ سے بھی جاؤں گا۔ ایسے ہی لفظ تھے کہ انہیں کھا گئے۔ رکتے رکتے جنوں ہو گیا۔ ایک روز غزل پڑھتے پڑھتے انہوں کھڑے ہوئے غزل کو چاک کیا۔ گھوڑے پے سوار ہوئے اور جنگل کی طرف نکل گئے پھر کبھی شہر کا رخ نہیں کیا۔ کلام غدر میں تلف ہو گیا۔

اسی عہد میں ایک ہزار شیوه شاعرہ بھی تھی۔ بھلا ساتھ تھا، غیرت ناہید، فصیل کشور پاکستان، بملی بستان اردو زبان، ہفت رنگ ہفت بیان، ہر صفحہ ہر میدان میں روائی نشر و ظلم دونوں میں جاری۔ نشی لفظ میں خوب ہنر دکھاتی تھیں۔ کوفتے کمال خستہ بنتی تھیں۔ ایسے کہ جس ادیب نے ایک وفع کھالئے وہ ان کے دستِ خواں کی بھی بن گیا۔ باغیوں اور بیوروکریٹوں میں یکساں مقبول تھیں۔ ملحدیں اور دینداروں نوں ان کے حلقہ مذاہین میں شامل تھے۔

جادہ شیری مردِ فضول بود۔ مشاغلِ عشق کرنا، کتابیں پڑھنا، یاروں کے خلاف کروارشی کی مہم چلانا۔ یکمشت بہت سے شعر لکھ کر پوچھی دوستوں کے پاس امانت رکھو دی ساتھ اس وصیت کے کہ ہمارے مرنے کے بعد انہیں نذر آتش کر دینا۔ دوستوں نے اشارے کو سمجھا اور انہیں بصورت کتاب چھپوا دیا۔ یوں وہ صاحبِ دیوان بنے۔ عامل بھی تھے۔ روز رات کو ایک گل پڑھ کر سوتے۔ صحیح کو اختحتے تو اختحتے کے نیچے سے دور پے بصورت سکر رانجی الوقت برآمد ہوتے۔ کہنے والے کہتے تھے کہ اس بزرگ کے پاس کالا علم ہے۔

سامنی، اسم الرحمان، سلیم الحنفی نام میں اختلافات پایا جاتا ہے۔ بہر حال بھلا ساتھ تھا۔ ہفت زبان تھے۔ صاحب طرز تھے۔ انگریزی چا سروالی اور اردو ملاوجی و ای لکھی شرفاء ان کی تحریر پڑھتے تھے تو لغت ساتھ لے کر بیٹھتے تھے یہ تحقیق طلب ہے۔ ڈاکٹر سیمن نے چند انگریزی افسانے اس دعوے کے ساتھ پیش کئے کہ یہ اس فاضل مصنف کے اردو افسانوں کے ترجمے ہیں مگر وہ افسانے اردو میں نایاب ہیں۔ تحقیقین جب اردو متن دریافت نہ کر سکے تو یہ تک ظاہر کیا کہ افسانے انگریزی میں خود ڈاکٹر موصوف نے لکھے ہیں اور از راہ دوست پروری اس فاضل سے منسوب کر دیئے ہیں

عبد ساجد مردِ عاشق پیشہ۔ کہانی میں محمد لکھنے کا ہمراج ہوا کیا۔ معنی ان کی کہانی میں اس طرح نمودار ہوتے تھے جیسے کالی رات میں جگنو۔ ماہر جنگو پکڑ کر ٹوپی میں چھپاتے تھے اور خلقت کو دکھا کر حیران کرتے تھے۔

اسی دور میں سیتا ہرن بھی گزری ہیں، جنہوں نے راما ن بطرز جدید لکھی تھی۔ طرز بیان کیا خوب تھا کہ سنکرت اردو میں اور اردو انگریزی میں لکھی۔ چندے اس دیار میں رہیں۔ ایک روز کاشمن ریکھا سے قدم نکالا تھا کہ بہک گئیں۔ بعد دیار ہند میں دیکھی گئیں۔

جاتے جاتے اپنے زیورات اس دیار میں پھینک گئیں۔

مفخر چالابی سلسلہ جلا بیہ سے تھے۔ نو طرزِ مرصع عرف نے لسانی را بطور کے خالق۔ عمارت میں کوئی آسان لفظ آ جاتا تھا تو پوری عمارت پر خط تخفیخ پھیر دیتے تھے۔ ایک لفظ کا مطلب سمجھنے والوں نے سمجھ لیا تھا سو اسے انہوں نے دیوان سے خارج کر دیا۔ لوگ ان کے شعر سننے تھے اور بوجہ نہ سمجھ پانے کے سردھنے تھے جو سمجھ پاتے تھے وہ ان سے بھی زیادہ سردھنے تھے۔ آخر آخر میں ایک نئی زبان ایجاد کرنے کا سودا سر میں سایا۔ پتا لانا یا تھا مگر پڑھا ہوا پانی چھڑ کنے لگے تھے کہ آخری چلو پر بہک گئے۔ پانی چلو سے ٹپک گیا اور پتا لازمہ ہوتے ہوتے مردہ ہو گیا۔ بس اسی سے دماغ چل بچل ہو گیا۔ اول جلوں مکنے لگے۔ سلسلہ جلا بیہ والوں نے اسے ہی نئی زبان جانا اور اپنی نئی شاعری کے لئے ٹونکا گردانا۔

عالی گہر جمالی۔ جہاں آباد کے پری زادوں میں تھے۔ جب جہاں آباد کا پانی کراچی کی سست بہا تو وہ بھی بہہ کر اس دیار میں آگئے۔ پچھی پالنے کا شوق رکھتے تھے۔ مگر پچھی ان سے وفا نہیں کرتا تھا۔ آنکھیں دکھاتا تھا اور اڑ جاتا تھا۔ محب وطن ایسے تھے کہ شاعری ترک کر کے قومی ترانے لکھنے شروع کر دیئے۔ مگر مرغی اپنی جان سے گئی کھانے والوں کو سوادن آیا۔ حب الوطنی کا تقاضا کرنے والوں نے ان کی حب الوطنی کی قدر نہ جانی۔ اس سے طبیعت میں یاں کارنگ آگیا تھا۔ لکھنے والے ادیبوں سے شاکی تھے۔ مخذور ادیبوں کی مدد پر کربستہ رہتے تھے۔

مقدراً انقلابی شاعر تھے پھر انقلابی بن گئے۔ ان کی شاعری انقلاب کی مذہر ہو گئی۔ انقلاب کو زمانہ کھا گیا۔ جہاں سے چلا کرتا تھا۔ دیں کالی بلی نے اس کا رستہ کاٹا اور پوری عمارت اڑڑا دھم کر کے نیچے آ رہی۔ پتہ چلا کہ یہ کسی ساحر کا بامدھا ہوا طسم تھا۔ کسی حریف ساحر نے اس کے توڑ میں ایک کالی بلی پیدا کی اور اس سے رستہ کٹوا کر اس طسم کو کاٹ دیا۔ اس سانحہ عظیم سے اس بزرگ نے ایسا اڑ لیا کہ قتوطیت جے آگے وہ کفر جانتے تھے ان کا شعار نہ ہبھری۔ افسوس کیا کرتے تھے کہ آدمی عمر اردو لکھنے میں ضائع کر دی آدمی عمر انقلاب کی حرمت میں صرف ہو گئی۔ یوں پوری عمر رائیگاں گئی۔

ایک تھے میاں مستفر تیز اڑ خیلی بعض محققوں نے انہیں مستقر تراڑ خیلی لکھا ہے بعض نے مستشرق تاریز اور بعض نے متدرک تراڑی نئی تحقیق یہ کہتی ہے کہ اصل میں وہ مستعصم تراڑ خیلی تھے۔ اس نام نے بولنے والوں کے لئے گوناگوں مسائل پیدا کئے۔ اس واسطے سے نام نے شہرت پائی اور یہ بزرگ نامور ہو گئے۔ پاؤں میں چکر تھا۔ زمین کا گز بننے ہوئے تھے۔ سدا سفر کرتے تھے۔ سفر نامے لکھتے تھے۔ حرکت میں برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم کو برکت دی تھی کہ انہیں کی طرح مستقل حرکت میں رہتا تھا۔

جنئے سفر کئے اس سے زیادہ سفر نامے لکھنے سفر بے شمار۔ سفر نامے قطار اندر قطار۔ فقاں نے اسے ادب پیدا کرنے کا نتھ جانا اور گرہ میں باندھ لیا۔ جس نے زندگی میں ایک سفر کر لیا اس نے سفر ناموں کے ڈھیر لگا دیئے۔ کسی کسی تن جلنے یہ سوچ کر کہ اگر ہم سفر کی سعادت سے محروم رہے تو کیا سفر نامے سے بھی گئے۔ قلم اٹھایا اور ایسا ایسا سفر نامہ لکھا کہ میاں مستعصم تارہ بھی خون تھوک گئے۔

نشیب و فراز جاں شاعر خوش بیاں۔ مشہور تراز شیطان۔ نابالغوں میں مقبول تھے۔ لڑکیاں ان کے اشعار کو مفید مطلب جانتی تھیں اور چن چن کر اپنے محبت ناموں میں نانکتی تھیں۔

مہاجر حسین المخلص پہ بھرتی۔ وطن مالوف کنکر کھیڑہ۔ مرد جاہل و مستکن بود۔ مسلمانی ان کی ملکوں حب الوطنی ملکوں تھی۔ افسانے لکھنے مگر ثقہ نقادوں کو ان کے افسانے ہونے میں کلام تھا۔ ایک رات کنکر کھیڑے کو خواب میں دیکھا۔ صبح ہونے پر احباب سے کہا کہ عزیز و ہم رخصت ہوا چاہتے ہیں۔ پوچھا کیسے اور کہاں۔ کہا کہ اپنے وطن اور ایسے یہ کہاں لکھ بند کر لی۔ ہمیشہ کے لئے نازیازی۔ شاعر بے بدلت۔ آدمی بے دماغ تھے کہ بس خود کو مانتے تھے دوسرا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ شاعری کے جنگل میں شیر کی مثال رہے کہ اپنے جنگل میں دوسرے شیر کے وجود کو گوار نہیں کرتا۔ منصوبے تیار کرنے میں یہ طولی رکھتے تھے مگر افسوس کہ ان کا ہر منصوبہ چوری ہو جاتا تھا۔ البتہ حلقہ ارباب ذوق کی فلک بوس عمارت کے منصوبے کو چور نے ہاتھ نہیں لگایا یہ منصوبہ جب تک ان کے پاس رہا وہ مرد خدا آفات ارضی سماوی سے دوچار ہوتا رہا۔ لا چار ایک روز اس منصوبے کو آئے میں گوندھ کر دیا برد کر دیا اور بقیہ عمر اطمینان سے بس رکی۔

تلیم احمد مرد آدھے اور شاعر پورے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے مناظرے بھی کرتے تھے مدھب کی حق کا حق تبلیغ کی۔ مگر شہرت ان کے احمد طلوے نے پائی۔

شاکرہ ناز نہیں۔ نام خدا پری چہرہ تھیں۔ ہم خرماؤ ہم ثواب پرواںے حسن بیان پر فریفتہ تھے۔ حسن صورت پر شیدا تھے۔ سرو مرسرور۔ عورت تھیں۔ گواہی میں آدمی افسانے میں پوری تھیں۔

مشتے نمونہ از خروارے۔ ان چکلی بھر چاںوں کو چکھو اور دیگ کا ذائقہ معلوم کرلو۔ مگر پھر یہ کم سوا دو سوچتا ہے کہ دیگ کا ذائقہ غالی ان دانوں سے کیسے معلوم ہو گا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے لکھنے میں عمر صرف کی اور ادباء کی صفح میں مقام پیدا کیا مگر اس دور میں متعدد ایسے ادیب نظر آتے ہیں جو اپنی ادبی شہرت کے لئے قلم کے شرمندہ احسان نہیں تھے۔ یہ نکتہ اس کم فہم کی سمجھ میں بہت خوار ہونے کے بعد سمجھ میں آیا۔ لکنے برسوں تک کتب خانوں میں سر پھوڑ تارہ، مخطوطوں کی چھان بین کرتا رہا۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ ان میں

سے کسی کا دیوان کیا ایک شعر تک دستیاب نہ ہو سکا۔ ہوا بھی تو پتہ چلا کہ یہ تو فلاں فلاں استاد نے لکھ کر اسے قیمتاً عطا کیا تھا۔ سنجیدہ نقادوں کے یہاں بھی ان کے کسی شعر یا نثری تحریر کا حوالہ نظر نہ آیا۔ مگر اس عہد کے اخباروں کے ادبی صفحوں پر ان کے نام نامی بمعنی تصویر نمایاں نظر آئے تھیں وی پروگراموں میں اس سے بڑھ کر نمایاں۔ اور سب سے بڑھ کر ادبی انعامات کے اسائے گرامی میں نمایاں۔

تحقیق و تدقیق کے بعد فقیر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس عہد میں ان ادیبوں نے جوز یور عقل سے آراستہ تھے لکھنے کو کار عبشت جانا اور ادیب بننے کے جدید طریقے اپنائے۔ ان ادیبوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دخنلی ادیب اور نمائشی ادیب۔

دخنلی ادیب وہ تھے جو اخباری بیانات پر دخنل کیا کرتے تھے۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں ادیب لکھتے کم تھے، بیان زیادہ چاری کرتے تھے کہ جابر سلطان کے سامنے کلد حق کہنے کا یہ واحد طریقہ تھا جو انہوں نے دریافت کیا تھا۔ میں نے ان بیانات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور بعد تحقیق کے ایسے مقدار ادیبوں کی ایک جامع فہرست تیار کی ہے جن کے دخنل اس عہد کے ہر اخباری بیان پر ثابت نظر آتے ہیں۔ یہ بیانات اس عہد کا بڑا تخلیقی سرمایہ ہیں۔ جس نے اس پر دخنل کر دیئے اس نے اپنی بخشش کا سامان کر لیا۔ جو دخنل کرنے سے رہ گیا اس نے گویا کو مٹھن کے مسلک سے روگردانی کی اور حق سے مخرف ہو جانے والوں کے ساتھ محسوب ہوا۔

دخنلی ادیب محرومین میں شمار ہوتے تھے۔ مگر ایک مختصر سادہ رایسا آیا جس میں وہ انعام و اکرام کے مستحق سمجھے گئے۔ اس دور کو چاروں کی چاندنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس چاروں کی چاندنی میں ہر دخنلی ادیب اپنے دخنلوں کے فیض سے جھوہریت کا محافظ ادیب شمار ہوا اور انعامات سے سرفراز ہوا۔ اغیار کی لکھی ہوئی تاریخوں میں اس دور کے ذیل میں ایک خسر اور ایک شوہر نامدار کے حوالے دے دے کر عورت کی حکمرانی کے خلاف دلائل فراہم کئے گئے ہیں مگر بیگمات کے آنسو کے مصنف نے اس دور کو ایک زریں دور سے تعبیر کیا ہے۔

نمائشی ادیب بیانات پر دخنل کرنے کے قائل نہیں تھے۔ ہاں اخباروں میں سرگلی تصاویر چھپوائے میں مضائقہ نہیں جانتے تھے۔ اپنے ساتھ شاہی منوار نے کا اہتمام بالالتزام کرتے تھے۔ تھی وی کے اشتہاروں میں بہت آتے تھے۔ حب الوطنی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسلام کے شیدائی تھے۔ اس کا دنیا میں بھی اجر پایا اور آخرت کو بھی سنوار لیا۔ تمغہ اور خطابات سے ان کی طبیعت ابا کرتی تھی۔ مگر تمغہ اور خطابات ان کا چیچھا کرتے تھے اور ہر برس بارش ابر کرم کی صورت ان پر برستے تھے۔ نقیب المذاہ حضرت نقیب کا نجومی کی مثال سے یہ امر واضح ہے۔ آپ نے جو قومی خدمات انجام دی تھیں ان کا ذکر اپنی زبان سے کبھی نہیں کیا۔

طبعیت کو خودستائی سے نفور تھا۔ مگر ایک حق گو محقق نے تحقیق کر کے آپ کی ملی و قومی خدمات کو جاگر کیا اور بتایا کہ اپنے زمانہ کسی میں جب قیامِ مملکت کی تحریک عروج پڑھی تو آپ نے ایک جلوس میں شرکت کی تھی اور نفرہ لگایا تھا۔ اس واقعہ کے منظر عام پر آنے کے بعد آپ کو اس عہد کے سب سے بڑے ادبی انعام سے نواز اگیا۔ آپ نے اظہارِ تشكیر کے طور پر حاکم وقت کی شان میں ایک نظم لکھی ہے سال کا بہترین شعری کارنامہ تسلیم کیا گیا اور انعام کا مستحق جانا۔ کہتے ہیں کہ اس نظم کے علاوہ بھی انہوں نے اقتضم نظم و نشر خامہ فرسائی کی تھی مگر وہ تو ق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ بہر حال یہ ایک نظم ایسی ہے کہ پورے پورے دیوانوں پر بھاری ہے۔ دوسری مثال شرپیاں کی ہے جنہوں نے ایک کالم اس باب میں باندھا کہ جمہور دوستِ عدل پرور صاحب سیفِ حاکم وقت نے سائیکل چلائی اور جب چورا ہے پہنچ کر حق کو سرخ پایا تو سائیکل کو بریک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ نیزِ ثریف کے سپاہی سے ہاتھ ملا یا۔ اس ایک کالم کو قبولِ عام شہرتِ دوام کی سند ملی اور اسی ایک کالم کی بنیاد پر وہ اپنے دور کے سب سے بڑے نشانگار مانے گئے اور سب سے بڑے ادبی انعام کے مستحق تھے۔ اس مبارک سائیکل اور اس کے سوار کی شان میں پھر بہت کالم باندھے گئے اور مضافاً میں نظم و نشر لکھے گئے لیکن حق یہ ہے کہ سب نے شرپیاں کا منہ چڑھا یا ہے یہ الگ بات ہے کہ فیضِ بقدر ظرفِ سب نے حاصل کیا۔ مگر وہ جو مولوی مدن والی بات تھی وہ پھر کسی تحریر میں نہ آئی۔

یہ حاکم اپنے وقت کا خوب تھا۔ خوب تو خیر اس دور کے سب ہی حاکم تھے وہ بھی جو اس سے پہلے گزر گئے۔ وہ بھی جو اسکے بعد آئے آگے ایک حاکم گزر اتھا کہ چچہ میئنے سوتا تھا چچہ میئنے جا گتا تھا۔ احکامات سوتے میں جاری کرتا تھا۔ بیداری کے ایام چور کے لئے وقت تھے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ابھی سویاں تھا کہ غیم نے حملہ کر دیا۔ تخت کے وفاور اطلاع دینے کے لئے پہنچے مگر خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے۔ آپس کی تکرار میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ شور کی وجہ پوچھی۔ وفاوروں نے عرض کی کہ حضور غیم چڑھا یا ہے سلطنت میں خلل پڑ چکا ہے۔ کہا پھر نیند میں خلل ڈالنا کیا ضرور تھا۔ عرض کیا کہ آدمی سلطنت ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ کہا کہ آدمی تو باقی ہے اور پھر سو گیا۔

اگلا جو حاکم آیا وہ خوب تر تھا۔ روشنی طبع سے مالا مال تھا کہ افلاطون دو راں کہئے تو بجا ہے۔ بیگمات کے آنسو کے مصنف نے ان کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اصل میں وہ خونقِ الانسان تھا اور بڑے خواب دیکھتا تھا۔ ایک شبِ خواب میں دیکھا کہ غیدِ بر اراقِ گھوڑے پر سوار ہے ہاتھ میں شمشیر براں ہے۔ صفحیں چیڑتا ہوا لال قلعہ کی فصیل پر چڑھ جاتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اس پر پرچم لہرا تا ہے۔ اس خواب نے اسے ایک ولہ تازہ عطا کیا۔ پر حیف کہ عمر نے وفات کی ایک دفعہ سالا راعظم نے اپنے خفیہ سلسے

معلوم کیا کہ داروغہ مطین نے سازش کی ہے۔ گھوڑا دوز اتنا ہوا محل میں پہنچا۔ وستر خوان بچھے چکا تھا۔ جب اندر اس نے قدم رکھا تو دیکھا کہ سلطان عالیٰ نوالہ شور بے میں ترکر کے منہ میں رکھا چاہتے ہیں۔ آگے بڑھ کر نوالہ ہاتھ سے چھینا اور فوراً ہی پاس بیٹھی بلی کے سامنے ڈال دیا۔ بلی نوالہ کھاتے ہی فور مر گئی۔ تب سالار اعظم نے سازش سے آگاہ کیا۔ سلطان عالیٰ نے عالم غیر میں داروغہ مطین کو طلب کیا۔ کہا کہ مرغابن جاؤ۔ وہ مرغابن گیا۔ فرمایا کہ کان پکڑو۔ اس نے کان پکڑے، حکم دیا کہ دیوار کی طرف منہ کر کے کان پکڑ کے کھڑے ہو جاؤ۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کان پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ جب سزا پوری ہوئی تو داروغہ مطین پیروں پر گرپڑا۔ گرگڑا کر کہاں جان بخشنی کی جائے۔ ازراہ ترجم فرمایا کہ جاؤ تمہاری جان بخشنی۔ آج سے ہمارے سالار اعظم ہو۔ سالار اعظم سے کہا کہ اب تم ہمارے داروغہ مطین ہو۔

وزیر بالتمیر نے دست بستہ عرض کی کہ سلطان عالیٰ سالار اعظم کو داروغہ مطین بنانے کی لم سمجھ میں نہیں آئی۔ فرمایا کہ جو شخص ہمارے ہاتھ سے نوالہ اچک سکتا ہے وہ سلطنت بھی چھین سکتا ہے۔ وزیر بالتمیر نے عہدے کی تبدیلی کی حکمت کو جانا اور داد دی۔ مگر پھر عرض کیا کہ جس موذی نے آپ کی جان لینے کی سازش کی اسے جان سے مارنے کی بجائے اور ترقی دے دی فرمایا کہ سازش سے ہم نے جانا کہ کمپنٹ نے ذہن رساپایا ہے۔ کیا عجب ہے کہ جو کام ہم سے رہ جائیں انہیں وہ پورا کرے اور ایسا ہی ہوا۔ سالار اعظم بن کر پہلے اس نے سلطان عالیٰ کا کام تمام کیا۔ پھر تخت پر بیٹھ کر کچھ سلطان شہید کے چھوڑے ہوئے کام پورے کئے کچھ نئے کام انجام دینے۔

یہ حاکم اپنے کارناموں میں سب پچھلوں سے سبقت لے گیا۔ اس نے بھی ایک خواب دیکھا تھا کہ جیسے سرفقد و بخار اس کے سامنے سرگنوں ہیں اور وہ کھوپڑیوں کا مینار کھڑا کر کے فتح کا ڈنکا بجارتا ہے۔ مگر کمپنٹ عمر نے اس کے ساتھ بھی وفا نہیں کی۔ واقعہ یوں ہے کہ اس دیار کے ہر حاکم نے کوئی نہ کوئی خواب ضرور دیکھا۔ مگر ہوا بھی کہ تعبیر میں جب ابھی ایک آجی کی کسر ہوتی تھی تو یا تو قطعاً مدد عمر غپتے جاتی تھی یا یہود و ہندو کی سازش کام دکھا جاتی تھی۔ خیر تو اپنے کارناموں کی بدولت وہ سب پچھلوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ خلیفہ ہارون رشید کو بھی۔ بھیس بدل کر سائیکل پر بیٹھ کر بازار میں نکل جاتا۔ سائیکل کمال چلاتا ہاتھ سب سے ملاتا۔ اس کے وقت میں مسلمانوں کے تہتر فرقے خوب پروان چڑھے۔ ہوتے ہوتے ایسے صاحب ایمان پیدا ہوئے جنہوں نے کفر کا تعاقب کرتے کرتے خود مسلمانوں کے اندر کافر دریافت کرنے شروع کر دیئے۔ پتہ چلا کہ پورے پورے فرقے کفر کے گڑھے میں اور قصر مذلت میں پڑے ہیں۔ انہیں ایک ایک کر کے غیر مسلم اقلیت قرار دیا اس آخر کے تیسیں یہ ہوا کہ غیر مسلم اقلیتیں اکثریت میں تھیں اور مسلم اکثریت

اقلیت میں مگر اسی اقلیتی اکثریت کے پیچے استاد فائدہ فلکی بھی تھے کہ بعد حسرت ویاں کہا کرتے تھے کہ اے کاش میں اپنی زندگی میں کوئی ایک مسلمان دیکھ لیتا۔ آخری وقت میں وصیت کی کہ میرے یار عزیز گنمام سرفقدی کو میری نماز جنازہ میں شریک ہونے سے نہ روکا جائے استدال یوں کیا کہ جب سب ہی کی مسلمانی مشکوک ہے تو کسی ایک پر اور وہ بھی ایسے پر جو میرا یا غم خوار ہے کیوں انگلی دھری جاوے اور کیوں اسے اس فقیر کی نماز جنازہ سے روکا جاوے۔ مرنے کے بعد پسمند گان میں وصیت کے باب میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ارباب فہم نے بھا کہ بندہ خدا عمر بھر زہد و اتقا کی راہ پر گامزن رہا۔ وصیت اسی کر گیا کہ ساری عبادت پر پانی پھر گیا۔ اس زمانے میں پاک بازی پر اصرار تھا۔ فاشی کے خلاف فہم تیز تھی۔ فحش نگار اور عریانی پرست ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جاتے تھے۔ گرد نیں ان کی ناپی جاتی تھیں۔ ایک کج ذہن اس بناء پر کہ گلتان، کا باب فہم پڑھتے ہوئے پایا گیا تھا معوب ہوا۔ البتہ گینگ ریپ کے باب میں ارباب فہم خاموش رہنا پسند کرتے تھے اس عکیمانہ عذر پر کہ بندہ بشر ہے بھول چوک سے بنا ہے۔ گینگ ریپ کے بارے میں اس کم فہم نے بہت تحقیق کی کہ یہ کیا اصطلاح ہے، کس زبان سے ہے اور اسکے کیا معنی ہیں۔ اس حد تک تحقیق کر سکا ہوں کہ یہ اصطلاح زبان انگلیسی سے ہے۔ ایک لفظ میں اس کے معنی سا جھکی ہندی یا لکھے نظر آئے اغلب اسی مفہوم میں یہ اصطلاح اس زمانے میں مستعمل تھی اور زبان زد خاص و عام تھی کہ اس کا چلن اس زمانے میں بہت تھا لیفٹی سا جھکی ہندی یا کا۔ مگر اس انداز سے کہ چورا ہے پر نہیں پھوٹی تھی اور ارباب فہم اس باب میں آنا کافی کو ترین مصلحت جانتے تھے ہاں ایک دفعہ چورا ہے میں پھوٹی تھی اس باعث کہ ہندی یا بول پڑی۔ شرافا اگشت بدنداں رہ گئے کہ ہندی یا بھی بولتی ہے۔ اس باب میں حیرت کے اسباب گوتا گوں تھے۔ اول اس سبب سے کہ یہ امر خلاف فطرت ہے۔ ہندی یا کہتی ہے، پھوٹی ہے، پر بولتی نہیں۔ دوم اس سبب سے کہ جس باب میں معلمین اخلاق بھی چپ رہنے کو ترجیح دیتے تھے اس باب میں ہندی یا بول پڑی۔ سوم اس سبب سے کہ وہ زمانہ تھگی ترشی کا تھا۔ خلقت کے تن پر کپڑا نہیں تھا۔ پہیت میں روٹی نہیں تھی؛ فاقتوں نے تو اتنا سلب کر لی تھی۔ گھوڑوں میں ہنہننا نے کی اور لوگوں میں آواز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ ایسے میں ہندی یا بول پڑی۔ سب حیران اور متھوش کر اسے کیا کہا جائے۔ ایک خود مند نے کہا کہ جو بولتا ہے وہ گواہی دیتا ہے۔ شرافاء نے کہا کہ یہ تو ہندی یا ہے جس کے پاس زبان نہیں ہے۔ خود مند نے کہا کہ قرب قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ ہے کہ مرغی بانگ دے گی اور ہندی یا بولے گی۔ گواہی کی اس وقت بھی صورت ہو گی۔ زوج ہو کر علماء و شرافاء یہ بولے کہ چونکہ وہ ہندی یا ہے اس لئے اس کی گواہی آدمی گواہی ہے۔

اس زمانے کی تاریخ ایسے واقعات عجیب اور کوائف غریب سے بھری ہے کہ انہیں بیان کرتا چلا جاؤں تو دفتر لکھے جائیں یہ سوچ

کر کہ رسالہ لہبانہ ہو جاوے فقیر نے چیدہ چیدہ و اتعات بیان کردیئے جیں اور نادرہ روزگار شخصیتوں کا سرسری تذکرہ کر دیا۔ عمر نے وفا کی تو یہ کوتاہ قلم اس داستان عبرت کی مزید تفاصیل قلمبند کر لے گا۔ فی الحال تھوڑے کو بہت سمجھا جاوے اور اس شعر پر اس تذکرے کو ختم تصور کیا جاوے سو۔

تازہ خواہی داشتن گردا نہائے سینہ را  
گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ پارینہ را



# احسان منزل

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب علامہ راشد الخیری ابھی زندہ تھے اور رسالہ عصمت ہر مہینے باقاعدگی سے احسان منزل میں پہنچتا تھا۔ ”عصمت“ کی خریداری بھی دراصل احسان منزل کی تاریخ کا بہت اہم واقعہ ہے۔ یہ پرچہ جب پہلی مرتبہ احسان منزل میں پہنچا تو سارے محلہ میں ایک شور پڑ گیا۔ جس نے سا اس نے دانتوں میں انگلیاں داییں اور قرب قیامت کی پیشین گوئی کی اس روز مولوی مہربان علی اپنے بیٹے کے منی آرڈر کی امید میں ڈاک خانہ گئے ہوئے تھے۔ ڈاکنے اس وقت ڈاک چھانٹ رہے تھے۔ مولوی صاحب کیا وسمیت ہیں کہ ایک پیکٹ پر ماہنامہ ”عصمت“ دہلی چھپا ہوا ہے اور اس کے نیچے سرخ روشنائی سے شیخ عرفان الحق کی بیٹی کا پتہ لکھا ہوا ہے۔

مولوی مہربان علی کی آنکھیں بھٹکی کی بھٹکی رہ گئیں۔ وہ اپنا منی آرڈر تو بھول گئے اور ایک تازہ حادثے کے راوی بن کر محلہ کو لوئے۔ انہوں نے محلہ کے چند سنجیدہ آدمیوں کو یہ واقعہ بڑی رازداری سے سنایا کہ عرفان الحق کے گھر رسالہ آیا ہے اور یہ کہ انہوں نے اس پر اپنی آنکھوں سے ان کی بیٹی کا نام لکھا ہوا دیکھا ہے۔ لیکن ایسی خبر بھلا کب بھٹکی ہے سارے محلہ میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ عرفان الحق کی کنواری بیٹی کے نام رسالے آتے ہیں۔ کنواری لڑکی کے نام رسالے آتا ہے خود کوں ہی کم معیوب بات تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ پتہ میں نام بھی اس کا لکھا ہوتا تھا۔ ولی سے یہاں تک کا ڈاک کا سفر کچھ ایسا مختصر رہ تھا۔ نہ معلوم کتنے مردوں نے اور کیسے کیسے مردوں نے یہ نام پڑھا ہوگا اگر عرفان الحق ذرا عقلمند ہوئے تو پتہ میں بجا ہے ”محترمہ محمودہ بانو شیخ معرفت شیخ عرفان الحق“ کی عبارت کے سیدھا سادہ فقرہ ”شیخ عرفان الحق“ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کی عقل تو کہیں چرنے چلی گئی تھی۔ جب اس افواہ نے زیادہ زور پکڑا اور اعتراضات ان تک پہنچنے شروع ہوئے تو انہوں نے بات پر پردہ ڈالنے کی بجائے اٹھی ہٹ دھرمی دکھائی۔ جس کسی معارض کا نام ان کے کائن میں پڑا اسے انہوں نے جاہل اور دینا نوی سمجھ رہا یا اور علی الاعلان یہ بات کہی کہ عورتوں کی تعلیم کا حکم کلام پاک میں آیا ہے۔ انہوں نے اپنے فعل کے جواز میں مختلف حدیثوں اور روایتوں کے حوالے سے یہ بھی ثابت کیا کہ حضرت فاطمہ زہرا عربی فارسی اور اردو میں دستز رکھتی ہیں۔ واقعات سے قطع نظر عقلی دلیل ان کے پاس یہ تھی کہ مدینہ علم کی لخت جگہ اور باب مدینہ علم کی لخت جگہ اور باب مدینہ علم کے گھر کی رانی جاہل کیسے ہو سکتی تھی۔ پتے میں محمودہ کے نام کا جواز بھی حضرت فاطمہ زہرا کے نام ہی کا مر ہونا مشت تھا۔

پر آتا ہے۔

دہ کہتے تھے کہ نبی کی بیٹی سے زیادہ باعصمت اور پرده دار اور کون عورت ہو سکتی ہے۔ اور ان کا نام آج تک ہزاروں ناخمر موسوی زبان عرفان الحق کی ساری دلیلیں برحق لیکن ان کا یہ اقدام تھا باغیانہ ہی نہ ہوئے شیخ احسان الحق زندہ ورنہ یا تو وہ بیٹی کو کان پکڑ کے گھر سے نکال دیتے یا خود کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاتے۔ یوں زمانے کا طور ان کی زندگی ہبھہ میں بگڑ چکا تھا اور سر سید کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ لیکن احسان منزل کی روایات پہ انہوں نے آج نہیں آنے دی۔ ان کے آگے دوجوں بیٹیاں بیٹھی تھیں لیکن مجال تھی کہ کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا۔ پر وے کا جواہ تمام سات پتوں سے چلا آتا تھا وہ بدستور قائم تھا۔ شیخ صاحب پر وے کی اس روایت پر شدت سے عامل تھے۔ جس کے زیر اثر کنواری بیٹیاں باپ بھیوں تک سے چھپتی تھیں۔ شیخ صاحب کو یہ تو پتہ تھا کہ ان کے دو بیٹیاں ہیں اور عرفان کو یہ معلوم تھا کہ گھر میں اس کی دو بہنیں رہتی ہیں۔ لیکن ان کی خلک و صورت کیسی ہے۔ یہ تو باپ کو پتہ تھا اور نہ بھائی کو۔ بڑی لڑکی خدا بخشنے بڑی بدنصیب تھی۔ اس کے نہ تو پھول کھلے اور نہ باپ اور بھائی کی صورت دیکھنی اسے نصیب ہوئی۔ شیخ صاحب باہر بیٹھے بیٹھے ٹکھیوں اور ڈاکٹروں کا انتظام کرتے رہے اور بیٹی اندر دم توڑتی رہی۔ اس جنتی بی بی کا سورج نے سرکھا دیکھا ہو یانہ دیکھا ہوا تناٹے ہے کہ مرتبے دم تک کسی غیر مرد نے کجا باپ اور بھائی نے بھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ احسان منزل کے زنانے میں غیر مرد کا شاید ہی کبھی گزر ہوا ہو۔ ہاں بھیتی ضرور آتا تھا۔ دو ٹکھنٹوں دروازے پر شور مچاتا اور جب بڑی بوڑھیاں اور پچھی بالیاں سب کروں میں چلی جاتی تھیں تب وہ دبے پاؤں سر جھکائے اندر آتا گھرے بھرتا اور نظریں پنجی کے باہر چلا جاتا۔ غیر مرد اور ناول اور افسانے کی کتابیں دنوں کو احسان منزل میں ایک ہی حیثیت حاصل تھی۔ زبانی کہانیوں پر پابندی عائد کرنا تو خیر آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ ویسے ناول اور افسانے کی کتاب کا احسان منزل کے زنان خانے میں کبھی گزر نہیں ہو پایا۔ رہا الف لیلہ کا معاملہ تو اس کے گزر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے وہ اس زمانے میں ہر گھر میں پراسرار طور پر موجود رہتی تھی۔ اور کسی وقت بھی کسی بھی نجی کے نیچے سے برآمد ہو سکتی تھی۔ البتہ ذپی نذیر احمد کے ناول بے ضرر سمجھے گئے تھے اور زنان خانوں میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن شیخ صاحب نے ان پہ بھی روک ٹوک کی۔

لیکن قدرت بھی بڑی ستم ظریف ہے۔ بیٹی نے خاندان کی ساری روایات کو خاک میں ملا دیا۔ بینا حضرت نوح کا بھی بہت بدنام ہے۔ لیکن عرفان نے تو کوئی تسری ہی نہیں لگا کے رکھا۔ ہر بات میں باپ کی ضدی۔ اس نے تو باپ کی زندگی ہی میں ہاتھ پر نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے علی گڑھ کا لج میں پڑھنے کے لئے بہت ضد کی لیکن شیخ صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ

بڑھاپے میں مجھے اپنی عاقبت بگاڑنی منظور نہیں ہے۔ مجھے خدا کو مند دکھانا ہے وہاں کیا جواب دوں گا۔ لیکن عرفان کے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ اس نے ایک روز یہاں تک کہہ ڈالا کہ اصل چیز نیچر ہے۔ اڑتے اڑتے یہ خبر شیخ صاحب تک پہنچی۔ انہوں نے سارا گھر سر پر اٹھایا۔ انہیں تو یقین ہو چلا تھا کہ ان کا بیٹا نیچر یہ ہو گیا ہے اور اس بناء پر وہ اسے عاق کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن خاندان کے بڑے بوڑھوں کے بیچ میں پڑ جانے کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ خاندان کے ہر بزرگ نے عرفان کو سمجھایا کہ بیٹا خاندان کی عزت کا خیال نہیں ہے تو کچھ اپنی عاقبت کا ہی خیال کرو۔ عرفان اس وقت تو چرکا ہو گیا۔ لیکن دماغ کا کیز انہیں نکلا۔ ایک دفعہ وہ بائیس رجب کے موقع پر نیاز پر بھی اعتراض کر بیٹھا۔ اس کے بعد اسے وہابی کا خطاب ملا۔

عرفان کو انگریزی پڑھنی نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے وہ نیچری نہ بن سکا۔ لیکن شیخ صاحب کے مرنے کے بعد ہی نذر نیاز اور رسم و رواج پر اس نے اس شدت سے اعتراض کئے کہ لوگوں کو یہ یقین ہو ہی گیا کہ وہ وہابی ہو گیا ہے۔ شیخ صاحب کے مرتے ہی اسے بزرگی کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ اور عرفان سے یہاں کیک وہ شیخ عرفان الحق بن گیا تھا۔ لیکن جس شخص کے لمحن یہ ہوں اس کی بزرگی کب تک قائم رہ سکتی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دن میں شیخ عرفان الحق، شیخ عرفان الحق کھلانے کی بجائے شیخ عرفان وہابی کھلانے لگے۔ شیخ عرفان وہابی کا راج کیا آیا احسان منزل کی روایات ہی مقلوب ہو گئیں پہلے بہشتی کا طور یہ تھا کہ دروازہ دکھنے والا تھا اور جب سب عورتیں اندر کمروں میں چلی جاتی تھیں تو وہ اندر داخل ہوتا تھا۔ اب وہ منہ پر تولیہ ڈال بے دھڑک زنا نخانے میں چلا آتا تھا۔ چھوٹی شیخانی دروازے کی اوٹ کھڑے ہو کر خانہ میں سے بے محابا بائیں کرتی تھیں اور اکثر ان کی باتوں کی آواز مردانے میں پہنچ جایا کرتی تھی۔ شیخانی بھی کے زمانے میں یہ عالم تھا کہ 22 رجب کی نیاز پر ایندھن کی لکڑیوں کو گھنٹوں تریزے دیتیں، تمین مرتبہ پاک کرتیں اور پھر ان پر پوریاں پکاتی تھیں۔ لیکن اب ایندھن تو کجا چھٹا پھونکتی تک کو پاک نہیں کیا جاتا تھا اور پوریاں کمرے سے صحن تک میں آجائی تھیں۔ خواہ بیچ میں موری ہی کیوں نہ پڑے۔ محمودہ پندرہ سو لے کے سن میں تھی لیکن باپ کے سامنے بے محابا آتی تھی اور اب عصمت کا پرچم بھی اس کے نام جاری ہو گیا تھا۔ تھوڑے دن بعد لا ہور کا ایک پرچہ ”تہذیب نسوان“ بھی اس کے نام آنے لگا۔ اور پھر راشد الخیری کے ناول کی وی پیاس اس کے نام موصول ہونے لگیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود احسان منزل میں انقلاب اتناز بر دست نہیں آیا تھا جتنا لوگوں نے سمجھا تھا۔ بیچارے شیخ عرفان وہابی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بدنام ہو گئے تھے۔ محمودہ تعلیم ضرور حاصل کر رہی تھی لیکن اسے آزادی کا پروانہ نہیں ملا تھا۔ چھوٹی شیخانی اتنی نا عاقبت اندیش نتھیں کہ جوان بیٹی کو کھلی چھٹی دے دیتیں۔ اگر بھی اس کا سر بھی ذرا کھل گیا تو چھوٹی شیخانی نے اس پر روک ٹوک

کی ہر جوان لڑکی کا کسی نہ کسی موقعہ پر الہڑچال چلنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ لیکن چھوٹی شیخانی تو محمودہ کو فوراً نوک دیتی تھیں ”لبی بی یہ کیا طور نکالا ہے چلنے کا۔ سیانی لڑکیاں ایسے نہیں چلا کر تیس کمر جھکا کر چلا کرو۔“ زور سے ہنسنے تک پہنچنے اعتراف تھا ہنسی اپنے عروج پہنچنے نہیں پاتی تھی کہ وہ بول اٹھتی تھیں۔ ”محمودہ یہ کیا تھیکرے پھوٹ رہے ہیں۔ بیاہ تو ہو جانے دو خوب ہتنا مگر کنواریت میں ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں۔“ محمودہ نے جب کبھی ذرا زیادہ بننے سنورنے کی کوشش کی۔ چھوٹی شیخانی نے اسے یہی تهدید آمیز بشارت دی کہ ”مینی ماں کے گھر یہ چنک مٹک اچھی نہیں لگتی۔ دلہامل جائے پھر تمہیں آزادی ہی آزادی ہے۔“ محمودہ نے جب اپنی قمیض کا گریبان گردن سے ذرا نیچا کاٹ لیا تھا تو بھی انہیں یہی اعتراف ہوا تھا۔ محمودہ جب نہاد ہو کر یہ قمیص پہن کر نکلی تو چھوٹی شیخانی کا اسے دیکھتے ہی پارہ چڑھ گیا۔ کہنے لگیں ”مینی کنوار پت میں یہ بے حیا۔ ماں کا گھر اچھا نہیں لگتا کیا؟ میں تمہیں بامدھ کے تو نہیں رکھوں گی۔ تھوڑے دن کی بات ہے۔ اپنے گھر چلی جاؤ تو پھر جو مزاج میں آئے کرنا۔“

اس حرم کے تمام موقعوں پر شیخ عرفان وہابی یا تو غیر جانبدار ہے یا چھوٹی شیخانی کا ساتھ دیا۔ وہ تعلیم کے قائل تھے آزادی کے قابل نہیں تھے۔ اگر انہوں نے مینی کو انگریزی نہیں پڑھائی تھی تو اس کی وجہ یہی خیال تھا کہ لڑکیاں انگریزی پڑھ کر آزاد ہو جاتی ہیں۔ وہ روشن خیالی کی انتہا اسی کو سمجھتے تھے کہ لڑکی کو اتنا پڑھا لکھا دیں کہ وہ اصلاحی اور تربیتی کتابیں اور رسائل پڑھ سکے اور محمودہ اتنا پڑھ لکھ گئی تھی۔ عصمت بک ڈپو سے جو کتاب بھی شائع ہوتی۔ محمودہ نے اسے منگانے کا اشتیاق ضرور ظاہر کیا۔ شیخ عرفان وہابی کو اس شوق کو پورا کرنے میں اعتراف کبھی نہیں ہوا۔ لیکن اتنا اہتمام انہوں نے ضرور کیا کہ راشد الخیری کے ناول کم اور تربیتی کتابیں زیادہ منگالی جائیں۔ راشد الخیری کے ناول بے ضرر ہی لیکن پھر ناول تھے۔ نہ معلوم کس ناول میں کیا لکھا ہوا تکل آئے البتہ تربیتی کتابیں منگانے پر وہ خود محمودہ کو مائل کرتے تھے۔ چنانچہ جب ”عصمتی دسترخوان“ کے لئے اس نے روپے مانگنے تو انہوں نے مطلق پھر مجھ نہیں کی اور پہلی کو تxonah ملتے ہی اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

”عصمتی دسترخوان“ کی وی۔ پی کے انتظار میں محمودہ نے کئی دن بڑی بے چینی سے کائے۔ ڈاک کے وقت بے چینی میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ لیکن کم جنت ڈاکیہ آتا اور کوئی خط ڈال کر واپس چلا جاتا۔ وی۔ پی کی کتابیں محمودہ کے نام پر ہی آتی تھیں۔ اس لئے وی پی براہ راست محمودہ کے پاس لا لی جاتی اور وہ رسید کی چٹ پر دستخط کر کے کتاب کھولتی شیخ عرفان وہابی کو وہی پی وصول کرنے یا انہیں کھولنے سے کبھی دچپنی نہیں ہوئی بلکہ اتنی الجھن ہوتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ جانے انہیں کیا سوچی کہ بیٹھ کیں جس ڈاکیہ آیا تو انہوں نے خطوط کے ساتھ ساتھ وہی پی بھی وصول کر لی۔ انہیں یہ دیکھ کر کچھ تعجب سا ہوا کہ بندل پہ عصمت بک ڈپو کا نہیں بلکہ کسی دوسرے

ناشر کا پتہ درج تھا۔ انہوں نے بندل جو کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ”عصمتی دستِ خوان“ کی بجائے پریم چند کا ناول ”بازارِ حسن“ رکھا ہے۔  
شیخ عرفان وہابی سنائے میں آگئے۔

شیخ عرفان وہابی نے بیٹی سے تو پچھنیں کہا لیکن اس دن رات کو شیخ اور شیخانی میں سرگوشیوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ محمودہ نے بہت کان لگائے مگر وہ صرف ایک ہی فقرہ سن سکی۔ شیخانی کہہ رہی تھی ”اتی یہ لوئڈ یا ہمارا منہ کالا کرائے گی جیسا بھی لوئڈ اٹے بس اس کے چار بول پڑھا ہی ڈالو۔“

یہ بھی ایک ستم طریقی ہے کہ انسان سے زیادہ انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کی عمر ہوتی ہے۔ آدمی میں ہزار عیوب سہی لیکن ایک تو وہ اوچھا نہیں ہے۔ دوسرے اسے اپنی ذات پر اعتماد ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیزیں بناتا ہے جو اس سے زیادہ عمر پاتی ہیں، احسان منزل شیخ احسان الحق نے بنوائی تھی۔ قبر میں ان کی بڑیوں کی خاک تک اب سلامت نہ ہوگی۔ لیکن ”احسان منزل“ ابھی تک صحیح و سالم کھڑی تھی۔ احسان منزل سے زیادہ پرانی ”احسان منزل“ کی روایات تھیں۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان روایات کی بنیاد کس نے ڈالی تھی اور کس کی ذہنی اچیج اور نفیاٹی اچیج نے اس کی بنیادوں کو پختہ کیا تھا۔ شیخ احسان الحق کا تو اتنا کارنامہ تھا کہ انہوں نے ان کی حفاظت کے لئے ”احسان منزل“ بنوادی۔ احسان منزل نے کئی دور اپنی آنکھوں سے بننے گزرتے دیکھے اور سلامت کھڑی رہی۔ سید احمد نجفی سید احمد علیہ الرحمۃ بنے۔ ذپیٰ نذر احمد کا فرد مرتد بننے کے بعد مصلح قوم مٹھرے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے ناولوں پر ایک اور عمارت کھڑی ہوئی اور راشد الخیری کے ناول ہر گھر میں دیکھے جانے لگے۔ پھر اچانک پریم چند کے افسانوں اور ناولوں نے زور باندھا۔

”احسان منزل“ کے بزرگ ”احسان منزل“ سے بھرت کر کے قبرستان میں چلے گئے تھے۔ اور کل کے بچوں نے بزرگوں کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اب ان کی جگہ بچوں کی ایک نئی کھیپ کروں اور صحن میں امنڈتی نظر آتی تھی۔ شیخ عرفان وہابی اور چھوٹی شیخانی کی آنکھ بند ہوتے ہی محمودہ نے، محمودہ بوکی اور سجاد دو لہا نے شیخ سجاد کی حیثیت اختیار کر لی عجلت میں جو بھی شادی ہوتی ہے اس میں کچھ گھپلا ضرور رہ جاتا ہے۔ سجاد دو لہا یوں انٹرنس پاس تھے لیکن تھے انکھوں اور شادی کے بعد بھی انکھوں رہے۔ اس لئے محمودہ کو پرانے گھر جانے کی زحمت انھائی نہیں پڑی۔ احسان منزل میں ہی اس کا گھر بس گیا۔ انکھوں پن ہے تو عیوب ہی مگر انکھوں ہوتے ہیں قسم کے دھنی۔ بزرگوں کی موجودگی میں ان کی حیثیت کچھ بھی ہو مگر ان کے مررتے ہی وہ خاندان کے مذہب ہن جاتے ہیں۔ بعض انکھوں دونوں جنم میں مزے اڑاتے ہیں۔ جوانی میں چھوٹے میاں کھلاتے ہیں۔ بڑھاپے میں بڑے اباں جاتے ہیں۔ سجاد جوانی میں چھوٹے میاں اس

لئے نہ کہلا یا کہ اس نے احسان منزل سے باہر ایک ایسے گھر میں ہوش سنجا لاتھا جس کی مالی حیثیت کچھ ایسی ہی تھی بڑھاپے میں بڑے ابا کا مرتبہ اس لئے حاصل نہ ہوا کہ گنتی کے دو بچے تھے، ایک لڑکا ایک لڑکی۔ ان کی بات قبول عام کا شرف کیا حاصل کرتی تو بات صرف اتنی رہی کہ سجاد و حسین اپنے گھر سید ہے سادے سجادوں ہے، احسان منزل میں آکر سجاد و دلہماں گئے اور شیخ عرفان وہابی کے مرلنے پر شیخ سجاد و کی حیثیت اختیار کر لی۔

بعض خواہشیں نسلوں بعد جا کر پوری ہوتی ہیں۔ یہ خواہش عرفان وہابی کی تھی کہ علی گڑھ میں جا کر تعلیم حاصل کریں وہ علی گڑھ کا لج میں تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن ان کا نواسہ بہت دھوم سے علی گڑھ بھیجا گیا شیخ سجاد نے اسے علی گڑھ بھیجتے وقت گھر میں یہ اعلان کیا تھا کہ ”هم اعجاز کو بی اے تک بڑھائیں گے“، اس پر محمودہ بونے بڑے چاؤ سے کہا کہ ”خدا نظر بد سے بچائے اللہ نے چاہا تو میرا اعجاز خاندان میں پہلا بی۔ اے ہو گا۔“

اعجاز کی قسمت پر حمیدہ کو شیخ ضرور ہوا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اسے علی گڑھ نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ اول تو یہ کہ علی گڑھ میں ایسا کون سا اپنا بیٹھا تھا۔ جس کے گھر حمیدہ کو چھوڑا جاتا۔ پھر یوں بھی محمودہ بو اور شیخ سجاد لڑکوں کو کانج میں تعلیم دلانے کے سخت خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اصل چیز تعلیم ہے اور وہ گھر پر بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اسے عملی جامدہ بھی پہنایا۔ چنانچہ انگریزی کا ماسٹر کھا گیا جو دونوں وقت احسان منزل میں آتا اور پردے کے پیچھے سے حمیدہ کو انگریزی پڑھاتا۔ کہنے والوں نے سب کچھ کہا۔ ساری برادری میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ محمودہ کی بیٹی انگریزی پڑھ رہی ہے۔ دنیا میں ہر طرح کی طبیعتیں ہوتی ہیں بعض شریف طبع نیک طبیعت عورتوں کو اس کا لیقین نہیں آیا۔ سلیمان نانی نے اسے محمودہ بو پر تہمت قرار دیا لیکن ان کا ایمان کب تک سلامت رہتا۔ اجو نے قسمیں کھا کر کہا کہ اس نے اپنی آنکھ سے ”احسان منزل“ میں انگریزی کی کتاب دیکھی ہے۔ پھر اسی نے یہ روایت بھی سنائی کہ حمیدہ کو ایک ماسٹر پڑھانے آتا ہے۔ یہ خبر جس نے بھی سنی اس نے کانوں پر ہاتھ درکھے۔ سلیمان نانی کو اس واقعہ سے بہت عبرت ہوئی۔ انہیں بے ساختہ محمودہ بو کی پھوپھی یاد آگئیں۔ کہنے لگیں ”لبی لبی یا آج کی ہی بات ہے۔ اسی محمودہ بو کی پھوپھی مرتے مر گئی۔ باپ بھیوں کی صورت نہ دیکھی اور آج اسی گھر میں ماسٹر پڑھانے آتے ہیں۔ تو ہب توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔ اجو کا خیال تھا کہ اس واقعہ سے شیخ عرفان وہابی کی روح کو سخت تکلیف پہنچی ہو گی۔

صرف اس ایک واقعہ پر منحصر نہیں ہے۔ لوگوں کو احسان منزل کے اور بہت سے بدلتے ہوئے طریقوں پر اعتراض تھے۔ شیخ عرفان وہابی کے زمانے میں بائیکس کی نیاز کی پوریاں صرف صحن میں آسکتی تھیں۔ اب وہ بیٹھک میں بھی پہنچتی تھیں اور چائے کے ساتھ

ناشتر کا کام دیتی تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ منی کے کونڈے بھی غائب ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ چینی کے پلیٹ لے رہے تھے۔ ایک سال محمودہ بونے یہ ستم کیا کہ ایک کونڈا مسکھی پوریوں کی بجائے بالوشان ہیوں کا کیا۔ محمودہ بورم کے خدر پر اب پر دے سے بھی بے نیاز ہوتی جا رہی تھیں۔ خانہ مال سے پرداہ تو اخیر انھی گیا تھا۔ کبھی کبھی سعی کی آمد کے موقع پر بھی یہ ہوتا کہ حمیدہ تو اندر چلی جاتی اور وہ کہتیں ”میرے بال سفید ہونے کو آئے اب میرا کا ہے کا پرداہ ہے۔ بھیا آنکھیں نیچی کر کے آجا“ حمیدہ کے لباس اور طور طریقوں میں بھی ایسی تبدیلی آئی تھی جو آج سے پہلے احسان منزل کی کسی کنواری لڑکی میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ حمیدہ نے گریبان کے نئے نئے کاٹ سیکھ لئے تھے محمودہ بونے کنوار پت میں بھی ڈھیلا پا جامد نہیں پہننا لیکن حمیدہ تھک مردی کا پا جامد پہننا اپنی کسرشان سمجھتی تھی۔ محمودہ بونے لوگوں کی باتوں پر بالکل وھیان نہیں دیا باس میٹی پر کڑی نگاہ رکھی۔ وہ تعلیم اور آزادی دونوں کی حامی تھیں لیکن بے شرمی کی حامی نہیں تھیں۔ نیچے گریبان پر وہ کبھی معرض نہیں ہو سیں لیکن دوپتہ جب کبھی سینے سے ڈھلانا محمودہ بونے سختی سے تنبہہ کی۔ جب ماشر پڑھانے آتا تھا تو پرداہ کے پیچھے وہ بھی میٹی کے برابر جا کر نیچھی تھیں۔ جب وہ کسی کام میں مصروف ہوتیں تو پھر فوراً گھر کے سارے کام کو چھٹی دے کر اس فرض کو انجام دیتیں، محمودہ بونے یہ بھی صاف کہہ دیا تھا کہ ”هم لوئنڈیا کو کوئی امتحان نہیں والا میں گے۔“ ان کا استدلال یہ تھا کہ ”ہمیں اپنی میٹی کو ایف۔ اے، بی۔ اے کر کے کوئی توکری تھوڑا ہی کرانی ہے۔“ محمودہ بونے پر رہی لکھی تھیں اس لئے اس پر بھی نظر رکھتی تھیں کہ میٹی کس قسم کی کتابیں پڑھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس معاملہ میں کچھ زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی تھیں۔ اس وجہ سے ان کی تھوڑی اسی بدناہی بھی ہو گئی تھی۔ یہ بات محلہ بھر میں مشہور تھی کہ محمودہ بونے کو لوئنڈیا ناول پڑھتی ہے اور یہ محض افواہ نہیں تھی۔ حمیدہ نے راشد الخیری ہی کے نہیں بلکہ پریم چد کے بھی ناول پڑھ رکھے تھے۔ پھر عظیم بیگ چغتائی کی کتابیں پڑھنے کا بھی اسے چرکا پڑ گیا تھا۔ البتہ نہش کتابوں کا احسان منزل میں کبھی گزرنہیں ہو پایا۔ محمودہ بونے محتاط پہلے بھی تھیں لیکن جب نہیں پچھی علی گڑھ ہو کر آئیں اور انہوں نے وہاں والوں کی بداطواریوں کا ذکر کیا تو وہ اور بھی چوکنی ہو گئیں۔

نہیں پچھی کا پینا شرافت، علی گڑھ میں تالوں کا کام سکھتے سکھتے اب اچھا خاصا مسٹری بن گیا تھا۔ نہیں پچھی اس کے پاس دو میئنے رہ کر آئیں اور اس کی آمدی کی طرف سے مطمئن ہو کر واپس آئیں۔ انہوں نے لڑکے لڑکیوں کا جو واقعہ بھی سنایا وہ حیرت ناک اور عبرت ناک ثابت ہوا۔ لیکن جس واقعہ کو سن کرواقعی سب عش عش کرنے لگے وہ یہ تھا کہ کانچ کی ایک لڑکی نے بے شرمی کے قصے لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ سلیمان نانی کی شرافت طبع پھر ان کے آڑے آئی۔ انہوں نے اس واقعہ پر یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ نہیں پچھی نے ان کے سر کی بھی قسم کھائی۔ لیکن انہوں نے پھر بھی کہا ”نابی بی میں نہ مانوں گی۔ ایسا ہوا تو قیامت نہ آ جاوے گی۔“

نخنی چچی کو اس پاک ذرا غصہ آگیا۔ اے لو بھجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ سارے علی گڑھ میں تو اس کا نام روشن ہو رہا ہے اور ایسے گھرانے کی بھی نہیں ہے۔ سختی ہوں کہ شریف گھرانے کی لونڈیا ہے کوئی اغتاً چھتائی والے ہیں۔ ان کی بیٹی ہے۔“

سلیمان نانی نے بے ساختہ تاؤ میں آ کر کہا ”خاک پڑے ایسے شریف خاندان پر جس میں ایسی باتیں ہو ویں۔“

دراصل اس کا سب سے زیادہ اثر محمودہ بوپہ ہوا۔ یوں انہوں نے اس کا بالکل اظہار نہیں ہونے دیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انہیں رہ رہ کر اعجاز کا خیال آرہا تھا۔

اس ذکر نے محمودہ بوکو اچھا خاصا خوفزدہ کر دیا تھا۔ ان کے دل میں ہولیں اٹھنے لگیں کہ کہیں کوئی لڑکی ان کے اعجاز کو اپنے پھندے میں نہ پھنسا لے۔ ان کا بس چلتا تھا فوراً تاریخیں کراچی کو علی گڑھ سے واپس بلایتیں۔ انہوں نے اپنے وسوسوں کا اظہار شیخ سجاد سے خاصی شدت سے کیا تھا۔ لیکن انہوں نے ہنس کے ٹال دیا۔ ان کی لاپرواہی رنگ لائی۔ محمودہ بوکو جس بات کا ذر تھا وہ ہو کے رہی۔ شرافت علی گڑھ سے جب آیا تو بینا متوں بعد آیا تھا مگر نخنی چچی کو ہوش کہاں تھا۔ انہیں ایک نیا کھڑا لگ گیا۔ چادر اور ٹھپک جھپک احسان منزل پہنچیں۔ چار پائی پہ میٹھتے ہی پہ لگیں۔ ”امی جمودہ بوی تمہارے لونڈے نے کیا کیا ہے میرا شرافت آیا ہے۔ کہوے ہے کہ احسان منزل پہنچیں۔“ اس روایت کے سہارے کے لئے کچھ زیادہ شواہد موجود نہیں تھے۔ لیکن روایت خود اتنی مضبوط تھی کہ شیخ اعجاز اور محمودہ بوکو سے قبول کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ محمودہ بوندو تو بری ہو گئیں۔ کچھ الزام انہوں نے قسمت کو دیا اور کچھ سجاد کو جنہوں نے اسے علی گڑھ پڑھنے بھیجا تھا۔ ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ اس مہم میں شیخ سجاد کو ان کی پوری حمایت و تائید حاصل تھی۔

اعجاز کو فوراً تارکھڑ کیا گیا اور جب تیسرے دن اعجاز گھر آیا تو شیخ سجاد اور محمودہ بوندوں کے دل میں شرافت کی روایت کی طرف سے جو تھوڑا بہت شبہ تھا وہ اس کے حلیہ کو دیکھ کر زائل ہو گیا۔ چڑھے پانچوں کا گاڑھے کا پانچا مرد گاڑھے کا سفید بگالی کرتا سر پہ بالوں کا جھنڈ کا جھنڈ۔ چھرے پہ عینک دہریوں کے سر پہ سینگ تو ہوتے نہیں بس انہیں علامتوں سے پچانے جاتے ہیں۔ خیر بیٹیں تک بات رہتی لیکن اعجاز نے دلیری یہ کی کہ شیخ سجاد کے منہ پر بات کہی کہ قلفتھ سے خدا کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ شیخ سجاد بہت دو نکے دہاڑے اور محمودہ بوندوں کی دھوکیں لیکن اعجاز عقیدے کا پاک تھا، اُس سے مس نہ ہوا۔

محمودہ بوکی رائے یہ تھی کہ اعجاز کو علی گڑھ واپس بھیجا ہی نہ جائے لیکن شیخ سجاد آخر مرد تھے۔ انہوں نے سمجھداری سے کام لیا۔

اعجاز کا انتہی مچھیت کا دوسرا سال تھا اور امتحان سر پر کھڑا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ”خیر یہ امتحان دے لو۔ لیکن اب آگے ہم نہیں پڑھائیں گے۔

سامان سفر سے چیزیں گم ہوتی اکثر دیکھی گئی ہیں اور اعجاز کا سامان یوں بھی عجلت میں بندھا تھا۔ تنت وفت پر اسے پڑھا کر اس کی کتابوں میں سے ایک کتاب گم ہے۔ سارا گھر ڈھونڈا گیا۔ نورن نے ایک ایک کونہ چھان مارا لیکن کتاب نہیں اور اعجاز اپنی ایک کتاب کھو کر علی گڑھ روانہ ہوا۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے محمودہ کو ہر چند یہ پڑھا کر ان کتابوں نے ہی اعجاز کے دماغ میں فتور پیدا کیا ہے پھر بھی انہیں بیٹے کے جانے کے بعد کئی دن تک اس کی کتاب کی فکر رہی اور انہوں نے اس سلسلہ میں حمیدہ سے لے کر نورن تک سب کو بتایا کہ ”گھر ہے بزار تو نہیں ہے۔ کتاب جائے گی کہاں بیٹیں ہو گی ڈھونڈو۔“ یہ سہر انورن کے سر بندھنا تھا۔ صبح کو بستر طے کرتے کرتے وہ ایک کتاب لے کر محمودہ بوکے پاس پہنچی ”بوجی! ذرا دیکھو تو سہی۔ یہ کتاب تو نہیں ہے۔ اعجاز میاں کی۔“

محمودہ بونے کتاب دیکھی تو ممکنہ تھیں، کچھ غصہ اور کچھ گھبراہٹ اور حیرت سے بولیں۔ ”علی گڑھ والی کی کتاب؟ اری کہاں سے آئی۔“

نورن بولی ”بوجی میں حمیدہ بی بی کا بستر جھاڑ رہی تھی۔ ان کے گدے کے نیچے تھی یہ کتاب۔“

محمودہ بونے اس بات کو پھیلانا مناسب نہ سمجھا۔ نورن سے وہ کتاب لے لی اور چکی ہو گئیں۔ البتہ رات کو جب تخلیہ ہوا تو انہوں نے شیخ سجاد کو یہ واقعہ سنایا اور کہا کہ ”جو ان لوگوں یا کا گھر میں بخانا اچھا نہیں ہے۔ اچھا بر اجیسا لوگ اسے ٹھکانے لگادو۔ اور میں پھر کہتی ہوں کہ امتحان جائے بھاڑ میں اعجاز کو واپس بلا لو۔“



## مجیدا

یوں مجید انج صاحب کے نام سے گھنٹا تھا۔ مگر جب ان کا آدمی اسے بار بار بلا نے آیا تو کم بخت مردت کی آنکھ۔ اسے منع نہ کر سکا۔ مجیدا میں یہی تو لاکھ روپے کی بات تھی کسی کام میں غدر ہی نہ تھا۔ کوئی بھی کسی کام کو کہے۔ جب ت اٹھ کھڑا ہوتا۔ پر ار کے سال جب ستوں نے ہزار تک تھی تو اس نے کھڑے بھر بھر گھر پانی پہنچایا تھا۔ اور یہ حال کیا کہ سنتے ہفتے بھر کے اندر اندر پانی مانگ گئے۔ پہلی والے کنویں پر اس نے دن دن بھر پانی بھرا ہے۔ محلے والوں نے بھی کمال کیا۔ پھوں اور بوڑھوں کی بات تو جانے دیکھئے۔ پہنچنے کے موئے مشنڈے گھڑے اور بالٹیاں اور اونٹے لے کر آتے اور اطمینان سے کنویں کی من پر رکھ دیتے مجیدا نے بھی چشمہ فیض جاری کر رکھا تھا۔ کنویں پر جو برلن آیا وہ بھرا ہوا ہی گیا۔ سید افی جی کے کوئی مردن تھا سوان کے گھروہ خود ہی پانی پہنچا کے آیا۔ حق یہ ہے کہ سید افی جی نے اپنے سارے اندھا پا محلے کے پھوں اور مجیدا کے زور پکا ٹھا۔ مجید ا محلہ بھر کا سو دا سلف لایا کرتا تھا۔ سید افی جی کو کیا وہ منع کر دیتا۔ منڈی میں جس کسی نے آموں کا نوکرا چکایا اور اسے مزدور نہ ملا اسے بال آخر مجید ہی کی مدد لینی پڑی۔ گڑ کے بھیلوں اور شکر قند یاں خریدنے والوں کی بھی اکثر اس نے مشکل حل کی تھی۔ اور بڑے کے گوشت کے معاملے میں تو سب تھے ہی اس کے محتاج۔ اول تو اسے گوشت کی پہچان ہی بہت تھی۔ پھر ہر قصائی سے اس کی تو ٹکار تھی جس کسی کے اچھا جانور ہوا اسی کے پہنچ گیا۔ اور اچھے سے اچھے حصے کو بنو کے لے آیا۔ اوپر سے چربی اور گردے مسترا دیکھنے کبھی کبھی یہ سانحہ بھی گزرتا تھا کہ کوئی بی بی اچھے خاصے گوشت میں کیڑے ڈالتی اور واپس کر دیتی اس معاملے میں چھوٹی سی میٹھانی بہت بد نام تھیں۔ چیزوں میں خرابی نکالنا ان کی عادت میں داخل تھا۔ مجید ا غریب کس گفتگی میں تھا وہ تو اس میاں کی لائی ہوئی چیزوں پر ناک مارتی تھیں۔ اس بات پر میاں بیوی میں نہ جانے کتنی مرتبہ بھنی ہو گی۔ مگر چھوٹی سی میٹھانی کی رسی کے بل جوں کے توں رہے۔ مجیدا کے لائے ہوئے سو دے میں تو وہ اور بد اکرنی نکالتی تھیں۔ سینے کا گوشت ہے۔ سنہری بولی چربی کی تھیں کی تھیں چڑھی ہو گیں، ایک سے ایک اچھی بڑی اور چھوٹی سی میٹھانی ہیں کہ بگڑ رہی ہیں ”ارے مجیدا یہ کتوں کے کھانے کا گوشت کہاں سے انھا لایا ہے نہ بابا ہم نہیں لیں گے یہ تجھڑے“ مجیدا چیزوں کو ٹھکانے لگانا بھی خوب جانتا تھا یہی گوشت وہ سید افی جی کو دے آتا اور الٹا احسان و ہر تاک سید افی جی خاص تمہارے لئے سینے کا بنو کے لایا ہوں سید افی جی ایک ایک بولی کی تعریف کرتیں اور اسے لاکھوں دعا بھیں دیتیں۔ اور مجیدا اپنے لائے ہوئے گوشت کی تعریف سن کر یوں پھول

جاتا جیسے شاعر اپنے شعروں کی تعریف سن کر پھول کے کپا ہو جاتے ہیں۔

جس پوچھتے تو سارا محلہ مجیدا کے احسانوں میں دبایا تھا۔ روزمرہ کا سودا سلف ہو یا بھی بھار کی شادی غمی ہو وہ بہر صورت ہر کام میں پا تھا بنا تھا۔ جب سیدانی جی کے اونٹے کے ختنے ہوئے تھتوں تک سے لے کر نیم کی ٹھینیوں تک کا انتظام اسی نے کیا تھا۔ حاجی گل باع علی کی بیٹی کے بیاہ میں براتیوں کے لئے چار پانیاں بھی جمع کر کے وہی لایا کھانے کے وقت پانی بھی اسی نے پلا یا۔ بہو کے ذو لے پر بکھیر کے وقت انہیوں دو نیوں کی تھیں بھی اسی نے تھامی۔ اور اسومیاں کے گھر تو شاید ہی کوئی کارہوا ہو جس میں مجید اش ریک نہ ہوا ہو۔ جب خود اسومیاں کی شادی ہوئی تھی تو اس نے کھڑے ہو کر اپنے سامنے بریانی اور قورٹے کی دیگیں اتر واٹیں اور جب بڑی سیٹھانی جنت کو سدھاریں تو اس نے کھڑے ہو کر اپنے سامنے قبر کھدوائی۔ جب پہلی مرتبہ چھوٹی سیٹھانی کا حمل دور ہوا تھا تو اس کو بلا کرو ہی لایا تھا۔ اور پھر جب دوسرا مرتبہ ان کی گود ہری ہوئی تھی تو آدھی رات کے وقت حلوائی کے دروازے کی کندھی بھی اسی نے لکھنکھائی تھی۔ اس کے بعد جب وہ صنک میں بیٹھیں تو کھیر کے لئے دودھ اور چاول وہی خرید کے لایا اور جب دینے والے نے اپنی چیزوں اپس لی تو کافور اور لٹھا بھی وہی خرید کے لایا۔ اسے کام سے مطلب تھا نہ کام کی نویعت سے۔ یوں سمجھتے کہ مجید اگر ادیب ہوتا تو ادب برائے ادب کے نظریے کا قائل ہوتا۔ آٹھ کی شب کو بڑے علم کے چڑھاوے کے لئے جو شخص سیدانی جی کو کھیلیں بتائے لا کر دیتا تھا وہ مجید اسی تھا۔ اور جس شخص نے ان کی مرغی کو بلی کے مند سے چھیننا تھا وہ بھی مجید اسی تھا۔ ان کی دوباری میں مرغیوں کا جو دڑ بابنا ہوا تھا اس کے لئے چکنی منی دراصل اسی نے فراہم کی تھی اور اس کے بدالے میں اسے گود بھر دعا میں ملی تھیں۔ یوں حاجی گل باع علی کے کوئی پر کا بک بنی ہوئی تھی وہ بھی بڑی حد تک اسی کی بھاگ دوڑ کی مرحون منت تھی۔ مگر حاجی جی دعا میں تو کیا دیتے شکر یا کا بھی ذیر ہ لفظ نہ کہا۔ اسومیاں مجیدا کے احسانات کا بدلہ گالیوں سے چکاتے تھے۔ تھوڑی بہت اگر کسر رہ جاتی تھی تو اسے چھوٹی سیٹھانی کی ہائے توبہ پورا کر دیتی تھی۔ اکثر ہوتا یوں ہے کہ چھوٹی سیٹھانی قسم کی عوتوں کے شوہر بڑے گورنیش ہوتے ہیں۔ لیکن اسومیاں تو چھوٹی سیٹھانی سے پھنسنے والے جانے میں اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ مجید اکونہوں نے زر خرید غلام سمجھو رکھا تھا۔ جہاں ذرا اسی چوک ہوئی اور انہوں نے لعن طعن شروع کی یہ مورچہ ختم ہوتا تو اندر سے توبہ داغنے لگتی تھی۔ چھوٹی سیٹھانی سے خدا بچائے سات پشتون کو اکھاز ذاتی تھیں۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ مجید ا ان کا نوکر ہے۔ مگر توبہ سمجھے، اسومیاں کو تو کر رکھنے کی کب توفیق ہوئی تھی۔ یوں سیٹھ صاحب اچھی خاصی جا سیداد چھوڑ گئے تھے۔ مگر ان کی بند مٹھی بھی کسی نے کھلتے نہ دیکھی اور چھوٹی سیٹھانی خود دانت سے پیسہ پکڑتی تھیں۔ مجید اسے کام لینے میں انہوں نے کبھی بخل نہیں کیا۔ لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ روپے دور روپے سے ہاتھ اٹھ جاتا۔ کھانے کا یہ تھا کہ

حاضر میں جنت نہیں۔ مجیدا وقت پر ہوا تو کھانا کھالیا، دیر سویر سے آیا تو وہ بھی غائب۔ وہ تو اس کی قائل تھیں کہ باسی بچے نہ کتا کھائے۔ ہاں محرم میں وہ ضرور لئے تلے سے خرچ کر دیتی تھیں مگر وہ تو سینئھ صاحب وقف چھوڑ گئے تھے، وہ خرچ کرنا ہی تھا۔ عزاداری کا ثواب تو اس میاں اور چھوٹی سی مہانی کو پہنچتا تھا اور پیر دوڑی مجیدا کو کرنی پڑتی تھی۔ امام باڑے میں سفیدی بھی وہی کرتا تھا اور چھکی شب کو چھوٹی سی مہانی کے لاذے کے لئے چاندی کی ہنسلی بھی وہی بنوا کے لاتا تھا۔ امام باڑے میں روزرات کو مجلس ہوتی تھی مگر وہ مجلس میں بیٹھا بھی نظر نہیں آیا۔ وہ امام باڑے کے پیچھے والے دالان میں تور پر بیٹھاناں لگتے دیکھتا تھا۔ ہاں تبرک بننے وقت وہ پھانک پر کھڑا نظر آتا تھا۔ تبرک تو خیر حاجی گل باغ علی بانٹتے تھے لیکن نانوں کی سینی لے کر مجیدا ہی کھڑا ہوتا تھا۔ کوئی کٹھلے کو ہاتھ لگانے کی اجازت مجیدا کو مطلق نہ تھی مگر وہ تو تور پر بینچہ کراون انوں کی سینی تھام کریں یہ سمجھ لیتا تھا کہ گھر باراں کا ہے۔

نج صاحب سے مجیدا کو جو اللہ مارے کا بیر ہو گیا تھا اس کی وجہ تھی کہ ان کے یہاں اسے اس قسم کا فخر حاصل کرنے کا موقعہ بھی میسر نہ آیا۔ اس نے حسب عادت مختلف موقعوں پر مختلف کاموں میں نانگ اڑانے کی کوشش ضرور کی تھی۔ مگر نج صاحب کے نوکروں کے سامنے بھلاکس کی وال گلتی تھی۔ نج صاحب تو خیر اپنی ریاست میں رکیس تھے ہی لیکن ان کے نوکروں سے زیادہ رکیس تھے۔ اور کرامت نے توحیدی کر کھی تھی۔ نج صاحب کی خدمت گاری کو اس نے نہ جانے کیا سمجھ رکھا تھا۔ کالے آدمی سے بات نہیں کرتا تھا۔ مجیدا کے مختلف اقدامات کو اس نے براہ راست اپنے اختیارات پر حملہ تصور کیا۔

مجیدا کے مزاج میں جتنی ایکاری تھی اتنا ہی ٹھسا بھی تھا۔ پیار سے اس کے کپڑے اتنا روکیں جہاں ذرا کسی نے نیز ہمی آنکھ سے دیکھا تو وہ بھی تن پھن ہو جاتا تھا۔ نج صاحب کی رعوت اور کرامت کی لاذ صاحبی اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔ شبرا تی کبابی کے چبوترے پر بینچہ کراس نے اعلانیہ کہا کہ ”یارو نج صاحب اللہ کی قسم بہت سفلہ ہے۔“ اس سفلہ پن کا سب سے بڑا ثبوت اس نے پیش کیا کہ نج صاحب کے چھوٹے لڑکے کی میں بھیگ چلی تھیں اور اب تک انہوں نے اس کا عقیقہ نہیں کرایا تھا۔ جب باسیں رجب کو مجیدا اور شبرا تی ایک پورے جلوس کے ساتھ کونڈے کھانے لگئے اور شبرا تی نے نج صاحب کے گھر کا ذکر کیا تو مجیدا نے ایک مرتبہ پھران کے سفلہ پن پر گفتگو کی اور کہا ”ایے یار کس کا ذکر کرے ہے۔ نج کونڈے کرے گا ابے گھاس کھا گیا ہے تو۔“

نج صاحب کا سفلہ پن اس کی وجہ ہو یا ان کی رعوت مجیدا نے بہر صورت ان کی ڈیوڑھی پر قدم رکھنے کی قسم کھالی۔ چنانچہ جب ان کے بڑے بیٹے کی شادی ہوئی تو اگرچہ ویمہ میں دنیا پہنچی مگر مجیدا وہاں جا کر نہ جھاٹا۔ شبرا تی بھی ویمہ میں گیا اور پلانا تو زردہ اور فیرنی کا قصیدہ پڑھتا ہوا پلانا۔ مجیدا کو اس روشن پر سخت طیش آیا۔ انہوں نے اس میاں کی شادی کا حوالہ دے ڈالا۔

”میاں دس وخت سینہ صاحب زندہ تھے انہوں نے کمال کر دیا۔ ساتوں کھانے دیئے برادری کا بچپن پیٹ بھر کے گیا۔“

”مگر پیارے کھانا نجح صاحب نے بھی بہت بڑھایا ہے۔“ شبراٰتی فیرنی اور زردے کامراً اتنی جلدی کیسے بھول جاتا۔

مجیدا کو اورتاو آیا۔ ”ہٹ یار۔ نج ویسا کھانا کیا کھا کے دے گا۔ قسم قرآن کی قورمد میں بالشت بھرتار کھڑا تھا۔ دس کے بعد چاندی کی رکنیوں میں مٹھائی ساری برادری میں بنی۔“

شبراٰتی حق نمک ادا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن مجیدا نے سینہ صاحب کے ولیمہ کا اس طفظنے سے ذکر کیا کہ شبراٰتی کی ساری دلیلیں دھری رہ گئیں اس موقع پر ہی نہیں دوسرے موقعوں پر بھی اس نے مجیدا سے ٹکست فاش کھائی تھی۔

نج صاحب کے چھوٹے بیٹے کے پہلے روزے پر جب مسجد میں افطاری تقسیم ہوئی تو شبراٰتی نے ایک مرتبہ پھر نج صاحب کی مدح سراٰتی کی خدائی اور پھر مجیدا سے منہ کی کھائی۔ شبراٰتی افطاری کی بریانی سے بہت متاثر تھا۔ لیکن مجیدا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہٹ یار یونج بڑا کنجوں مکھی چوس ہے۔ اللہ کے رسول کے نام یہ یو کیا دے گا۔“

”کچھ ہی کبوچیا افطاری تو دس نے خھانٹھ کی دی ہے۔“

مجیدا اس پر بہت تن پھنتا یا۔ ”یار یو افطاری تھی؟ اماں افطاری سینہ صاحب نے دی تھی۔ جب اسومیاں نے روزہ رکھا تھا۔ اور اس نے اس افطاری کا اس شان سے نقشہ کھینچا کہ شبراٰتی کا سارا ہوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں مجیدا کو اسومیاں کی کون سی ادا بھائی تھی۔ ویسے تو وہ ہمیشہ اسے گالیاں ہی دیتے دیکھے گے۔ اسومیاں مجیدا کو سب سے زیادہ گالیاں دیتے تھے اور مجیدا اسومیاں کا سب سے زیادہ کام کرتا تھا۔ جتنا وہ کام کرتا تھا اتنی ہی گالیاں دیتے تھے اور جتنی وہ گالیاں دیتے تھے اتنی ہی وہ ان کی تعریف کرتا تھا۔ ان معنوں میں نج صاحب بڑے بد قسم تھے۔ انہوں نے مجیدا سے نہ تو کوئی کام لیا اور نہ اسے کبھی گالی دی اور نہ مجیدا نے ان کی کبھی تعریف کی۔ اسے محض اتفاق سمجھئے کہ کرامت چلا گیا۔ اور جب اس کی بجائے کوئی نوکر نہ ملا تو انہیں مجیدا یاد آیا۔

مجیدا کو جب پتہ چلا کہ نج صاحب اسے بلا تے ہیں تو وہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گیا۔ کئی ایک پیغاموں کو تو وہ پی گیا۔ لیکن جب نج صاحب کا آدمی بار بار اسے بلا نے آیا تو پھر وہ منع نہ کر سکا۔ نج صاحب کے گھر جاتے ہوئے وہ خاص طور پر شبراٰتی کی دکان کی طرف سے گزرا۔ ایک ڈیڑھ منٹ دکان پر کھڑے ہو کے اس نے بڑی عجلت میں حقد کے چند گھونٹ بھرے۔ اور پھر چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یار دے نج صاحب نے تڑیائی لگا کھی ہے۔“

مجیدا بڑی نج مندی کے احساس کے ساتھ نج صاحب کے یہاں پہنچا تھا۔ لیکن جب اوٹا تو اس کا انداز بدلنا ہوا تھا۔ واپسی میں وہ پھر شبراٰتی کی دکان پر رکا اور چیزوں ترے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”یار یونج بڑا فرعون بے سامان بنا پھرے ہے۔ قسم اللہ پاک کی اب تو میں

وہ کی دوڑھی پر قدم نہیں رکھوں گا۔

”کیا ہوابے؟“ شبراتی نے سوال کیا۔

”یار حد ہو گئی؟“

”کیا حد ہو گئی؟ من سے بچوٹ نہ تا۔“ شبراتی کچھ جھنجلا سا گیا۔

”یار میں واں گیا تو بولا تمہارا نام ہے مجیدا؟ میں نے کہا کہ باں بھی۔ میں مجید اہوں۔“

شبراتی نے اسے ٹوکا ”ابے سالے اس میں لاڈ صالی کی کیا بات ہے۔ اسومیاں تو تجھے ہمیشہ توڑا خ کریں ہیں وہوں نے تجھے تم تو کہہ دیا۔“

”سن تو کہی بے۔“ مجیدا جھنجلا یا ”پھر کیا کیوں ہیں ..... وہ رکا اور پھر سنبھال کر بولا“ کہنے لگے کہ بھتی تو کری کرو گے؟ حد ہے

یار.....

مجیدا خاموش ہو گیا۔ اس نے حقے کی نے ہونٹوں میں دبائی۔ دو تین گھونٹوں کے بعد وہ پھر بڑا یا۔ ”حد ہو گئی یاڑ“ اور پھر خاموشی سے حقہ پینے لگا۔



## بیریم کار بونیٹ

یہ تو یہاں کسی کے وہم و مگان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ ٹک اندر یہ اور شکا ہتیں ضرور تھیں لیکن وہ دوسری قسم کی تھیں۔ اور وہ بھی بعد میں پیدا ہو گیں۔ شروع میں تو جسے یہاں کوارٹر مل گیا سمجھا کہ جنت مل گئی۔ حالانکہ اس وقت شکا یتوں کی زیادہ گنجائش تھی۔ بجلی ابھی نہیں آئی تھی۔ سڑک بھی نہیں بنی تھی۔ آدھ پون میل تک کچے کچے رستے طے کرتے ہوئے سڑک تک جاتے تب کہیں بس شینڈ کی صورت نظر آتی اور بس کا یہ عالم کھڑے کھڑے ٹانگیں دکھ جاتیں اور اس کی شکل دکھائی نہ دیتی۔ مگر اشرف چاچا یہ خبر لائے تھے کہ سڑک الگے میئنے سے بننا شروع ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد بس یہاں اندر تک آیا کرے گی اور پندرہ پندرہ منٹ کے بعد چلا کرے گی۔ ان معاملات میں اشرف چاچا سے زیادہ باخبر کون ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ہم نے مان لیا۔ اس سے قطع نظر امپرو ومنٹ ٹرست والے آخر آدمی تھے، ال دین کا چراغ تو ان کے پاس نہیں تھا کہ راتوں رات کوارٹر بھی بن جاتے اور بجلی بھی لگ جاتی اور سڑک بھی تیار ہو جاتی اور بس سروس بھی شروع ہو جاتی۔ یوں اگر سوچو تو ال دین کا چراغ بھی اس سے زیادہ کیا تاشیر دکھاتا ہم نے کیا تغیری ہوتے دیکھی نہیں ہے۔ دو پھر یوں پہ دو پھر یاں گزری چلی جاتیں اور راج مزدور اسی ایک رفتار سے روڑتے توڑتے رہتے، بھری بچھاتے رہتے، اینٹوں سے لدے پھندے گدھے اور گارا بھری پر اتنیں اٹھائے مزدور قطار قطار آتے رہتے جاتے رہتے، لگتا کہ یہ سلسلہ یونیجی جاری رہے گا۔ پربال آخرا یک دن مکان بن کر تیار ہو جاتا، پھر اسی رفتار سے کنوں کی کھدائی شروع ہوتی اور جب زمین کھدتے کھدتے پانی کی تہہ دکھائی دیتی تو بتائے بنتے پھر ایک رات وہاں گیس کے ہنڈے رکھے جاتے، جام اور چاندنی بچھتی، اگر بتیاں سلگتیں اور میلاد منعقد ہوتا۔ اس کے بعد گھر آباد ہونا شروع ہوتا مگر ہمارے یہ کوارٹر دیکھتے تیار ہونے اور تیار ہونے سے پہلے آباد ہوئے، کتنے کوارٹر ایسے تھے کہ قائم تو کیا پلستر تک نہیں ہوا تھا اور لال رنگ دیواریں بیکھنی نظر آتی تھیں۔ ایسے بھی کوارٹر تھے کہ چوکھیں تو لوگ گئی تھیں مگر کنوں اڑ نہیں چڑھتے تھے اور اجلے برآمدوں میں بڑھتی دن رات ٹھوک پیٹ کرتے تھے۔ مگر جنہیں یہاں آباد ہونا تھا، بھر صورت آباد ہوئے جیسے قصبوں میں شام پڑے کسی کسی دوکان میں اندھیرا ہونے سے پہلے ہی چراغ جل جاتا ہے، پھر اس کی دیکھا دیکھی تین چار دکان نہیں چھوڑ کر کسی دکان کا یہ پروٹھ ہو جاتا ہے، اور پھر دکانوں کی لائٹنینگ اور یہ پ اور سرسوں کے تیل والے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں اور ہوتے ہوتے سارا بازار منور ہو جاتا ہے اسی انداز سے ہماری کالوں آباد ہوئی۔ کامٹھ کباڑ سے

بھرے بھیلے اور بھرے تانگے آج اس کوارٹر کے سامنے کھڑے ہیں کل اس کوارٹر سامنے جا رکے ہیں۔  
بس ہماری کالونی دیکھتے دیکھتے آباد ہو گئی۔ اور اب کسی کو یہ بھی یاد نہیں کہ کون کب آیا تھا البتہ بعض خاص واقعات سب کے ذہنوں پر نقش ہیں۔ مثلاً یہ سب کو یاد ہے کہ اس کالونی میں پہلی لڑائی وہ تھی جو سیدانی جی کی انبار والی سے ہوئی تھی۔ سیدانی جی پہلے انبار والی سے لڑیں۔ پھر دلی والی سے تھیں مگر وہ دونوں زبردست نہیں۔ سیدانی جی چند دنوں تین ریس مگر پھر آپ ہی آپ پانی ہو گئیں اور اعلان کر دیا کہ بی بی مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہے۔ میں تو کر بلاۓ معلمی چلی بھی گئی ہوتی مگر محسن کی پڑھائی بیچ میں آپزی امریکہ والا سے وظیفہ پر بلار ہا ہے۔ وہ امریکہ ہوا وے میں تو یہاں کھڑی پانی نہیں پیوں گی۔ دو بول نکاح کے پڑھوا کے کہہ دوں گی کہ بیٹا اپنا گھر سنجا لو۔ ماں کو عاقبت کی فکر کرنے دو۔

عجب بات ہے کہ کر بلاۓ معلمی جانے کی بات ہمارے سب تھی کے ذہن سے اتر گئی یا تو یوں کہیئے کہ انبار والی اور دلی والی نے دوسری بات کا چر چاز یاد کر دیا کہ جس کوارٹر گئیں یہ اطلاع پہنچانا اپنا فرض سمجھا کہ سیدانی کا پوت امریکہ جا رہا ہے یا یوں سمجھ لجھے کہ بیٹے کے ارادے میں ماں سے زیادہ خلوص اور گرمی تھی۔ محسن کو ہر چند کچھ راستے اور بسوں سے سخت شکایت تھی مگر سائکل خریدنے کا سوال کبھی نہ اٹھایا کہ کہیں وہی اس کے اٹھے ہوئے قدم نہ پکڑ لے۔ اور سیدانی جی تھیں کہ کر بلا جانے کا اعلان بھی کرتی رہتی تھیں اور گھر کے کار و بار کو پھیلاتی بھی جاتی تھیں۔ مرغیاں تو انہوں نے پہلے آتے ہی خرید لی تھیں۔ پھر نیم بھی لگایا تھا کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو اس کے سامنے میں تندو رکھو دیں گی۔

ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ واقعہ نہ ہو گیا ہوتا تو سیدانی کر بلاۓ معلمی کو بھول بھی چکی ہوتیں یہاں کی رہائش میں جو وقتیں تھیں ان سے تو محسن کو دو چار ہونا پڑتا تھا۔ سیدانی جی کے لئے تو آرام ہی آرام تھا، سب سے بڑا آرام تو یہ تھا کہ پچھواڑے رام گڑھ کے کھیت لگے ہوئے تھے جہاں سے بزری تر کاری تازہ اور سستی مل جاتی تھی۔ ایک بزری تر کاری پر کیا موقف ہے، کھانے پینے کی بہت سی چیزیں سستی مل جاتی تھیں۔ باریک چاول کی مثال لجھے کتنا مہنگا ہو رہا ہے اور جن دنوں سیدانی جی نے خریدا ہے ان دنوں تو وہ کسی بھاؤ بھی نہیں ملتا تھا۔ مولا کا حوالہ دے کر انہوں نے ایک کاشنکار سے خریدا تھا۔ یہاں چاول کس اہتمام سے خریدے گئے اور کس احتیاط سے سنjal کر کھے گئے مگر جو ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے پہلے وہ باور پی خانے میں رکھے گئے تھے مگر جب باور پی خانے میں چوہوں کا عمل دھل ہونے لگا تو بوری سے نکال کر انہیں دیکھیں میں بھرا گیا۔ دیکھا سامان والے کمرے میں لکڑی کے بڑے صندوق میں جس میں چینی کے برتن رکھے تھے رکھا گیا، اس پر رکابی ڈھکی گئی اور صندوق میں تالا پڑ گیا۔

ہماری کالوں میں چوہوں کا آنا اور پھینا اک داستان ہے۔ ان کی ابتداء بھی عجائب تھی انتہا بھی عجائب ہے ابتدائی کے باور پی خانے میں رکھی ہوئی جالی کے نیچے کے خانے سے ہوتی۔ جالی اس رات کھلی رہی تھی صحیح کوڑا حکن کئی دیگر چوں کے گردے ہوئے کئی ادھ کھلے پائے گے۔ رات کی چائے سے بچا ہوا تھوڑا دودھ کر دودھ دانی میں رکھا تھا اور دودھ دانی لڑھک گئی تھی۔ سیدانی جی نے اس کا سارا الزام انبالہ والی کی صندلی بلی کے سر تھوپ دیا جس پر اس روز سے اس گھر کے دروازے بند ہو گئے۔

پھر ایک دن دودھ کی دیگری سے دودھ دانی میں دودھ اندھلے ہوئے کالا کالا نقطہ سانظر آیا۔ سیدانی جی کو شک پڑا غور سے دیکھا تو شک یقین سے بدل گیا اس کی بلا دودھ والے کے سرگئی۔ سیدانی جی اس پر بہت بگزیں کہ میمیں کے لئے ہمارا ایمان خراب کرتا ہے۔ اس نے اپنی صفائی بہت پیش کی لیکن سیدانی جی کے سامنے ایک پیش نہ گئی۔ وہ یہ کیسے تصور کر سکتی تھیں کہ ان کے نئے کوارٹر میں جس کے ہر کمرے کا اور باور پی خانے کا فرش پکا ہے اور کہیں کوئی بل نہیں ہے چوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہاں کوارٹر کے پچھواڑے جہاں جھاڑیاں اور گھاس پھونس ہے اور اب آس پاس کے کوارٹروں کا کوڑا مستڑا ہے کہ دن بھر سیدانی جی کی مرغیاں اسے کریدتی اور دانہ دنکا چکتی رہتی ہیں باور پی خانے کی کھڑکی سے کوڑا چھکتے ہوئے انہوں نے ایک بھی سی دم جھاڑی میں بل کھاتی ضرور دیکھی تھی مگر ہر چند کہ زندگی میں انہیں بارہا چوہے کی دم پر سانپ کی دم کا اور سانپ کی دم پر چھکلی کی دم کا شک ہوا ہے۔ اس دم کو دم کے دم میں پیلی سے لال پڑتے دیکھ کر وہ پہچان گئی تھیں کہ گرگٹ ہے اور اگر چہ وہ گرگٹ کو جس نے حضرت عباس کا مشکیزہ کترنے کا گناہ کیا تھا زندہ چھوڑنے کی قائل نہیں ہیں مگر اس وقت باور پی خانے کی دیوار پیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے کوئی کارروائی اس کے خلاف نہیں کر سکی تھیں بہر حال لے دے کے یہ ایک دم تھی جو انہیں اس کوارٹر میں رہتے ہوئے دکھائی دی تھی۔ وہ دودھ والے کی بات کا اعتبار کیسے کر لیتیں۔

مگر ایک دن یوں ہوا کہ جب انہوں نے باور پی خانے میں قدم رکھا تو ایک اضطراب کے ساتھ برتن بیجے اور اک شے بجلی کی تیزی سے برتوں سے نکل کر جالی کے نیچے جاتی دکھائی دی۔ سیدانی جی بھی اسی پھرتی سے پیش، صحن میں رکھا ہوا میسا پانس اٹھایا اور باور پی خانے میں جا کر جالی کو کھنکھٹانا شروع کیا، نتیجہ صرف اتنا لکلا کہ وہ لمبی دم جو پہلے جالی کے پیچھے دکھائی دی تھی تالی میں دکھائی دی اور دم کے دم گم ہو گئی۔ اس روز انہیں معلوم ہوا کہ خرابی باہر کی نہیں باور پی خانے کے اندر ہو رہی ہے۔ مگر اس وقت بھی وہ بیکھیں کہ کہیں باہر سے کوئی چوہا بھٹک کر آگیا ہے اور اگر اس کا قلع قلع کر دیا جائے تو باور پی خانے میں پھر سے اس قائم ہو سکتا ہے، چنانچہ انبالہ والی کی صندلی بلی جوکل تک معتوب تھی خاص طور پر انبالہ والی سے منگوا کر رات کو باور پی خانے میں بند کی گئی۔

صحیح کو جب باور پچی خانے کا دروازہ کھولا گیا تو خرابی کی بڑکے مٹنے نہ مٹنے کے متعلق تو تحقیق نہ ہو سکی۔ ہاں یہ پایا گیا کہ خود صندلی بلی کی بدولت باور پچی خانے کی ہندزیوں دیپھیوں اور رکابیوں کا لفظ و نقش تباہ ہو چکا ہے۔ دوسری رات سید انی جی نے ہندزیاں دیپھیاں اور چینی کے برتنا احتیاط سے جانی میں ہند کر دیئے۔ پس صندلی بلی باور پچی خانے کے امن میں اس رات خلل نہ ڈال سکی البتہ صحیح باور پچی خانے سے نکلتے ہوئے وہ آنگلن میں گھومتی ہوئی بے پرواہ مرغیوں میں خوف و ہراس پیدا کر گئی۔ سید انی جی کی بروقت مداخلت نے جانی نقصان نہیں ہونے دیا مگر مرغیاں دیر تک ہراس کے ساتھ چلاتی رہیں اس روز سے سید انی جی کا ہیر و نی امداد سے اعتبار انٹھ گیا۔ دوسرے دن انہیوں نے محسن کو روپسید دیا اور کہا کہ نجوسٹ مارا چوہا کہیں سے آگیا ہے تو مجھے چوہے دان لادے محسن کو تو خیر چوہے دان خریدنا اور ہاتھ میں لے کر چلانا گوارانہ ہوا اشرف چاچا اس موقع پر کام آئے اور نصر و ٹین ساز کی دکان سے ایک چوہے دان خرید کر سید انی جی کو پہنچا دیا۔ سید انی جی نے اسی رات روٹی کا لکھڑا اس کے کانٹے میں لگایا اور باور پچی خانے میں رکھ دیا۔ صحیح کو انھیں تو ایک موٹے سے چوہے کو اس میں مقید پایا۔ اس قیدی کو نہ کانے لگانے کا فمدہ لی والی کے لوٹے نے لیا جو چوہے دان ہاتھ میں لئے آگے آگے جاتا تھا، پیچھے لوٹنے والوں کا ایک ہجوم تھا اور کئی کوارٹروالیاں باہر نکل آئی تھیں، اور سید انی جی کے مجرم کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے مسجد سے کوئی جوتیاں چراتا ہوا پکڑا گیا ہو۔ لوٹنے والوں کی یہ پلٹن کوارٹروں کے پیچھواؤڑے دور کھیتوں کی طرف نکل گئی۔ جب یہ پلٹن واپس آئی تو سید انی جی کو اپنے مجرم کا تو پتہ چل گیا مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ چوہے دان کا کیا ہوا۔

اس کے بعد باور پی خانے کا امن واقعی کچھ بحال ہوتا نظر آنے لگا۔ ویسے اب سیدانی جی ہر چیز سنجال کر جالی میں بند کرتی تھیں، چوہے کا اندیشہ نہ کہی اپالہ والی کی صندلی بلی کا کھکھا تو بدستور تھا۔ ایک مرتبہ والی کی ہندزیارات کو جالی سے باہر کھی رہ گئی تھی۔ صح سیدانی جی نے دیکھا کہ جیتن الگ پڑا ہے اور والی کی جگہ ہوئی تھہ پر زنجیر اپنا ہوا ہے انہوں نے نظر اٹھا کر روشنداں کی طرف دیکھا اور سوچا کہ شاید چڑیا اندر آگئی تھی اس زنجیرے کو وہ چڑیا کے پنجوں اور چونچوں کے نشان سمجھیں۔ پھر جب انہوں نے غسل خانے میں محسن کی میلی قمیض کو کترا ہوا پایا تو یاد آیا کہ وہ پچھلی مرتبہ اسے دھوئی کے ڈالنا بھول گئی تھیں۔ اور بڑیزانے لگیں کہ طاعون مار غسل خانے تک میں پہنچ گیا تھا۔ پچھے کی ساری قمیض چھلانی کروی۔

اصل حال کہیں محرم میں جا کر کھلا۔ سیدانی جی نے آٹھ کی شب کو پلاو کی حاضری کرنے کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ اعلان وہ ماتحتی انداز میں کرتیں۔ انہیں اپنا امام باڑہ یاد آ جاتا۔ اس میں سچے ہوئے سونے چاندی کے علم اور چھت میں لٹگے ہوئے جھاز فانوس ہانڈیاں اور یہ پیدا آتے، وہاں ہونے والی مجلسوں کا تذکرہ کرتیں جہاں دسوں دن نان قیمه تقسیم ہوتا تھا، آٹھ کی شب کو ہونے والی حاضری کا نقشہ

کھیچتیں جس میں خلقت نوٹی تھی اور شیر مال قورمے سے سیر ہو کر جاتی تھی۔ عجائبات ہے کہ پیلے کوارٹروالی وہیں کی رہنے والی ہے وہ کہتی ہے کہ سیدانی جی کے یہاں نان قیمه بنتا تو اسی سال بند ہو گیا تھا جس سال راشن ہوا تھا اور شیر مال قورمے کی حاضری کے متعلق کہتی ہے کہ میا ہم نے توجہ سے ہوش سنجا لاسیدانی کے گھر پلاو کی حاضری ہوتے دیکھی کہتے ہیں جب ان کے خرزندہ تھے تو شیر مال قورمے کی حاضری کرتے تھے۔ بہر حال عذاب ثواب کہنے والوں کی گروں پر ہم نے جوستا ہے دہراتے ہیں۔ ویسے سیدانی جی نے اس کوارٹر میں آ کر بھی دسوں دن مجلس کیں اور جلیبیاں باشیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان مجلسوں کی وہ دھوم نہ تھی وہ اپنے امام باڑے کی مجلسوں کی بیان کرتی ہیں۔ اول تو وہ مردانہ سے زنانہ مجلسیں بنیں اور زنانہ مجلسیں بھی ایسی کہ بس آس پاس کی کوارٹروالیاں وہاں پہنچتی تھیں اور رفتہ بہت کم ہوتی تھی البتہ آنھتارنخ کی حاضری کی شہرت کا لوٹی بھر میں ہو گئی تھی اور ہم سب پلاو کھانے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ مگر آنھتارنخ کو جو ہوا اس کا کے گمان تھا۔ سیدانی جی ایسی سہم گئی تھیں کہ اور کوئی انتظام بھی نہ کر سکیں جب شام ہونے لگی تو انہوں نے اشرف چاچا کو بلوایا اور جلیبیوں کے لئے روپے دیئے۔ ہم حاضری کے نام ایک ایک دودھلیبی کھا کر آئے کسی کے مند سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ واقعیہ ہے کہ ہم سب دہل گئے تھے۔

پہلے کوارٹروالی کو کچھ اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ انبالہ والی نے اسے یقین دلانے کے لئے اپنی عینی شہادت پیش کی میا میں تو خود دیکھ کے آئی ہوں۔ صندوق میں یہ بڑا مکلا کھلا ہوا تھا اور ساتھ میں اس نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں اور شہادت کی انگلیوں کو جوڑ کر دائرے کا نشان بنایا۔

”بہنوں میں یہ پوچھوں ہوں کہ انہوں نے صندوق کو کیسے کتر لی؟“

”اے لو صندوق کو کیسے کتر لیا۔“ انبالہ والی بولی ”صندوق آخر لکڑی کا تھا۔ اور میا یہ خوست مارے تو عذاب الہی ہیں۔ کیا کھانے پہنچنے کی چیز کیا برتنے کی چیز کتر کے بر باد کر دیتے ہیں۔“

دلی والی گم سم بیٹھی رہی۔ پیلے کوارٹروالی بھی سوچ میں پڑ گئی چپ بیٹھی رہی پھر بولی ”کمختوں کا پہیت تھا یا مشک تھی۔ اتنے بہت سے چاول۔“

انبالہ والی بات کا نتھے ہوئے بولی ”میا مجھے بھی اعتبار نہیں آیا تھا۔ سیدانی میرا ہاتھ کپڑ کے اندر لے گئی اور صندوق کھول کے دھایا۔ جھوٹ مت جانیو کوئی مٹھی بھر چاول پڑے ہوں گے۔ باقی میگنیاں“ انبالہ والی کو جھر جھری آگئی۔

دلی والی نے مختدا سانس بھرا ”اللہ رحم کرے۔“

پسیلے کو اورڑواںی آنکھیں پھاڑے دلی والی کو تختی رہی منہ سے کچھ نہیں بولی۔

اس رات سیدانی جی کی مجلس میں دور دور کے کوارٹر سے یہیں آئیں مجلس دیر تک رہی اور بہت رقت ہوئی۔ سیدانی جی کے واقعہ نے آس پاس کی کوارٹروں کو چونکا کر دیا۔ دلی والی نے دوسرے ہی دن اپنی بیٹی کا جیزیرہ کھولا اور ریشمیں کپڑوں کو دھوپ دینے کے لئے چار پائیوں پر پھیلا دیا۔ یہ کپڑے تو سب سلامت تھے۔ باں اپنا دوپٹہ جو کلف دے کر اداھے کھلی دراز میں رکھ دیا تھا کہ محروم بعد اس پر ستارے ناٹکے جانے تھے وہ جگہ جگہ سے کتراؤ اپایا گیا۔ انبالہ والی نے آٹا چھانا تو اس میں بھسی کم اور مینگنیاں زیادہ لکھیں۔ انبالہ والی اور دلی والی کو یہ بات سخت ناگوارگزی کہ سیدانی کے گھر کے چوبے ان کے گھر آجاتے ہیں۔ ان کا شک اور شکوہ جائز تھا۔ مگر یہ اتنی تو اس بات پر ہے کہ پیلا کو اورڑ سیدانی جی سے بہت فاصلہ پر ہے، مگر پسیلے کو اورڑواںی کے کئی میلے کپڑے کترے ہوئے پائے گئے اور کمال تو اشرف چاچا کے ساتھ ہوا کھیز کے لئے جو درخواست وہ دے رہے تھے اس میں کاغذات کی تعداد اتنی ہو گئی تھی کہ پن جو مژتو پسلے ہی گیا تھا ب دلکش ہے ہو گیا۔ انہوں نے کاغذوں کے کنوں پر آٹا لگایا اور چپکا دیا۔ صحیح کو ان سب کاغذوں کے کوئے غائب تھے۔

کاغذوں کی تھوڑی بھسی میز پر بکھری ہوئی تھی۔ اشرف چاچا نے یہ ذکر نہوا پر چونئے کی دکان پر آ کر کیا وہاں اس وقت مولوی عثمان علی مونڈھے پر بیٹھے یعنیک لگائے پسیلے درقوں والی اس کتاب کو دیکھ رہے تھے جس کے تین چوتھائی صفحے نہوا پڑیاں باندھنے میں صرف کرچکا تھا۔ انہوں نے کتاب سے نظر انھائی اور بولے اماں کیا پوچھتے ہو۔ مشنوی مولانا روم کا ایک نادر نسخہ مطبوعہ تہران میرے پاس تھا۔ بے ایمانوں نے اسے کتر کر برادہ بنادیا۔“

اشرف چاچا نہوا کی دکان سے سید ہے نصر و شیمن ساز کی دکان پر گئے اور ایک چوبے داں خرید لیا اور ان کے اس اقدام کی ہم سب نے بیرونی کی اور چوبے داںوں کی خریداری عام ہو گئی۔ نصر و شیمن ساز نے ایک دن کے اندر اندر چوبے داں اتنے بیچ کہ دوسرے دن جب سیدانی جی نے دلی والی کے لوئنڈے کو برا بھلا کئے کے بعد چوبے داں منگایا تو قیمت اس کی ایک روپے سے سواروپے ہو چکی۔ سیدانی جی نے چوبے داں واپس کر دیا اور نصر و کی بے ایمانی کی علی الاعلان مذمت شروع کر دی دلی والی نے انہیں سمجھایا کہ سیدانی جی چوبے داں منگے ہو گئے ہیں۔ مجھے بھی سواروپے کا ملا ہے بی بی کیا کیا جائے میں نے تو چار چوبے داں منگائے ہیں اور ہر کمرے میں ایک ایک رکھ دیا ہے۔“

سیدانی جی کا پارہ اس وقت اتنا چڑھا ہوا تھا کہ دلی والی کی بات نے ذرا اثر نہ کیا۔ دوسرے دن پارہ خود بخود اتر گیا اور انہوں نے

سوار و پیہے لے کر محسن کو نصر و کی طرف بھیجا۔ مگر اس وقت چوہے دان کا بھاؤ ڈیڑھ روپے ہو چکا تھا، ہم یہ کہتے ہیں کہ چوہے دان اس بھاؤ بھی سیدانی جی کو ستائی پڑا۔ اس کے بعد تو یہ حالت ہوئی ہے کہ ڈھائی ڈھائی روپے کا چوہہ دان ہے۔ اور خریداروں کا وہ ہجوم کہ خدا کی پناہ۔ نصر و ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا، اعلان کر دیا کہ قطار بناؤ، سب کو نمبر واری دوں گا۔ اس روز سے نصر و کی دکان کے آگے قطار بننے لگی اور جوں جوں دن گزرے یہ قطار بھی ہوتی گئی۔ ایک دن یہ قطار اتنی بھی ہوتی کہ بکھر گئی اور ہجوم دکان پر ٹوٹ پڑا اس پر نصر و نے تھانے والوں کو خبر کی جنہوں نے آکر بلکلا لامبی چارچ کیا اور مجع منتشر کر دیا۔

اشرف چاچا کہ نصر و کی یہ روشن بہت ناگوار گز ری۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ نصر و نے بہت چوہے دان یہچہ اب اس کے لئے چوہے دان تیار کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اسی دن انہوں نے ہم سب کے دستخط لے کر نصر و کے خلاف ایک درخواست داغ دی۔ اس درخواست پر فوری کارروائی ہوئی اور چوہے دانوں کا کنٹرول ہو گیا۔ چوہے دان کا کنٹرول ریٹ ڈیڑھ روپیہ مقرر ہوا تھا مگر اس ریٹ پر کالونی کے بس دو تین آدمیوں کو چوہے دان مل سکے اس کے بعد نصر و نے اعلان کر دیا کہ مال ختم ہو گیا۔ نصر و نے صاف جھوٹ بولا کیونکہ اسی شام کو اس نے مولوی عثمان علی کو ڈھائی روپے میں چوہے دان دیا ہے۔ مولوی عثمان علی کی ایمانداری اور پرہیزگاری کا لحاظ کر کے اس نے یہ قیمت لگائی تھی ورنہ اس کے بعد اس نے تین تین روپے میں بیچا ہے۔

ہم نے کہا ”اشرف چاچا چوہے دانوں کی بلیک ہو رہی ہے۔“

معلوم ہوا کہ اشرف چاچا پہلے ہی چمکنے بیٹھے تھے، بو لے بیٹھا کیا تباہیں باہر بلیک گھر میں سملگلنگ ہم دو کے پیچے میں پہن گئے۔ میں نے کہیں والوں سے کہا کہ یاروں خدا کے بندوں نہ دینا کچھ درخواست تو رکھ لو ورنہ یہ جائیداد کے کاغذ چوہے سملگل کر لیں گے۔ مگر وہاں ایک سے ایک بڑا فرعون بیٹھا ہے کسی نے نہیں سن۔“

اصل میں اشرف چاچا بہت جلد بول گئے ورنہ شاید محسن کو ان سے زیادہ ہی دفتروں کے چکر لگانے پڑے تھے۔ امریکہ کے لئے وظیفے کی درخواستوں پر ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ روز وہاں جاتا، سانوں لی رپورٹ، والی کو اپنے نام کی چیت دیتا اور سامنے والی شیشہ سے چمکتی گول میز پر بیٹھ جاتا اور اس پر بکھرے ہوئے کتابچے بغور پڑھنا شروع کر دیتا۔ اس کی باتوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ایک چھوڑکنی افسروں سے وہ مل چکا ہے مگر باقی کیا ہوتیں اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ مگر اشرف چاچا کیمپ آفس کے ہلکے تک بھی اس ایک ہی مرتبہ پتھر سکے دوسرے دن انہیں چپرا اسی نے اندر جانے سے روک دیا۔ اس میں کچھ خطاخواد اشرف چاچا کی بھی ہے جواب تک کچھ بیوں کی فضائیں رہتے ہیں اور چپرا اسی کو اٹھنی سے زیادہ دینے کے روادار نہیں ہیں۔

لکھیز آفس کے چکر کا نئے کا ایک فائدہ تو یقینا ہوا کہ اشرف چاچا کو بسوں کا تجربہ اور سڑک سے کالوںی کے اندر تک کے کچھ رستے کی طوالات کا اندازہ ہو گیا۔ کالوںی کے کوارٹروں کے متعلق بھی بہت کچھ معلوم ہوا۔ اشرف چاچا کی روایت یہ ہے کہ ٹھیکیدار نے سعف میں آدھے راونٹ ریسٹ ملایا ہے اس معاملہ میں دلی والی اشرف چاچا سے بھی زیادہ قتوطیت پسند نکلی۔ اس نے دیوار کو انگوٹھے سے بجا کر کہا ”اے بی، یہ درقاہی دیواریں کے دن کھڑی رہیں گی۔“ جب اس کالوںی میں پہلی بارش ہوئی اور سیدانی جی کی دیوار پکنے لگی تو انہوں نے مگر کر کہا ”کبھی ماروں نے چھٹ پائی ہے یا جملی منڈھدی ہے،“ اور پہلے کوارٹ والی اپنی پہلی رنگ والی چھٹ کو نکلتے دیکھ کر برملا یہ تھی کہ ”خدا نہیں سمجھے کا نہیں کھڑی کر کے پتھنگی کا غذ منڈھدیا ہے۔“

اشرف چاچا کو اس سارے گھپلے کا بڑی شدت سے احساس تھا کہ اس کے باوجود وہ اٹھنی سے نہیں بڑھے ہم پوچھتے ”اشرف چاچا آپ کا لکھر داخل ہونے کا کوئی بیوںت بنا۔“

اشرف چاچا جواب دیتے ”بیٹا چو ہے دان لگا رکھا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

تماشے کی بات یہ کہ اب ہمارے سب کے چو ہے دان اشرف چاچا کا چو ہے دان بن کر وہ گئے تھے، شروع میں تو ان میں بہت چو ہے پھنسنے لیکن اب عالم یہ تھا کہ کائنے میں روٹی کا لکڑا ایکارہتا تھا، منہ اسی طرح کھلا ہوا اور چو ہوں کی گھروں میں وہی ریل پیل، انبالہ والی بولی میا چو ہے چالاک ہو گئے ہیں۔ اب چو ہے دان میں نہیں آتے۔“

دلی والی نے لکڑا لگایا ”اے بے وقوف تو ہم ہیں کہ جو الابالی نگل لی۔ مجبور جو ہوئے چو ہوں کو کیا مجبوری ہے کہ مئلکوں کے برادے کے لئے چو ہے دان میں آئیں۔“

سیدانی جی کی کویہ بات بہت لگی۔ انہوں نے دوز و ھوپ کر کے گیہوں کے خاص آٹے کا انتظام کیا اور اس کی روٹی چو ہے دان میں استعمال کی۔ مگر چو ہے ایسے بد کے تھے کہ خالص آٹے کی روٹی پر بھی نہیں آئے تب انہوں نے چند اور نئے تجربات کئے۔ مثلاً خالص آٹے میں تو تیاکی ملاوٹ کی اور گولیاں بنا کر باور پی خانے میں جالی کے نیچے رکھ دیں۔ اس تجربے نے دو دن اپنا اثر دکھایا، تیسرے دن فیل ہو گیا۔ چو ہے باور پی خان کے ایک ایک گوشے کوٹولتے اور جو ہری گلی چیز پاتے کترڈالتے کھینچ کر لے جاتے اور تو تیامی آٹے کی گولیاں اسی طرح رکھیں رہتیں۔ سوکھتی رہتیں۔

محسن کی دانست میں چو ہوں کو مارنے کے یہ بڑے دیناوسی طریقے تھے۔ اس نے کتابچوں کے ذریعہ امریکہ کے زرعی نظام کے بارے میں جو نئی نئی معلومات حاصل کی تھیں اس کی روشنی میں اس نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا اور ماں کو بتایا تھا کہ یہ چو ہے تو کچھ بھی

نہیں۔ شکا گوکی فارموں میں اتنا بڑا چوہا آیا تھا کہ وبا کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مگر وہاں کے تعلیم یافتہ کاشتکاروں نے ہیریم کاربونیٹ سے دنوں میں ان کا قلع قلع کر دیا۔ سیدانی جی تو بیٹھ کی بات سے متاثر نہ ہو سکیں، مگر شہر سے واپسی میں بس اشرف چاچا سے یہ بات ہوئی تو وہ قائل ہو گئے۔ وہ بس سے اتر کے گھر گئے، گھر سے منور میڈیا یکل سشور گئے۔ اب تو خیر یہ بہت بڑا میڈیا یکل سشور ہے اور ڈاکٹر منور لمبی چکیلی موڑ کار میں بیٹھ کر آتے ہیں مگر ان دنوں یہاں گفتگی کی دو اسیوں کی شیشیاں اور پیکٹ رکھے رہتے تھے، باقی خانے خالی تھے انہوں نے اشرف چاچا کو بتایا کہ ہیریم کاربونیٹ نہ صرف یہ کہ ان کے یہاں نہیں بلکہ شہر کے کسی میڈیا یکل سشور پر نہیں ملے گی کیونکہ اس کی امپورٹ کم ہوئی تھی اور مالک یکا یک بڑھ گئی مگر یہ کہ انہوں نے آرڈر دے رکھا ہے اور ٹھیک عقریب آنے والی ہے۔

اشرف چاچا نے جب اس نے تریاق کا ذکر کیا تو ہم نے سمجھا کہ اشرف چاچا نے کوئی امر یکہ دریافت کیا ہے ہمارے لئے۔ یہ دریافت اور منور میڈیا یکل سشور پر اس کے آنے کی خبر ایک بہت بڑا واقعہ تھی۔ بات یہ ہے کہ اب ہم سب کی حالت سیدانی جی کی سی تھی۔ چوہوں نے ہمیں بہت خراب کیا، کھانے پینے پہنچنے اور ہر تنے کی کوئی چیز ان سے محفوظ نہیں تھی۔ دن میں ہر چیز اپنی جگہ پر قرینے سے نظر آتی۔ رات کو جانے کیا ہوتا کہ صحیح ہونے پر چیز جو بہت تھی تھوڑی نظر آتی، جو تھوڑی تھی غائب ہوتی، جو باور پی خانے میں رکھی جاتی وہ سامان کے کمرے میں اور جو سامان کے کمرے میں ہوتی وہ لان میں پڑی دکھائی دیتی۔ صحیح و سالم چیزیں اوھر کرتی اور پاک و صاف چیزیں ناپاک معلوم ہوتیں۔ چور رات کے پردے میں آتے اور صحیح ہوتے ہوئے غائب ہو جاتے۔ بس نشانات باقی رہ جاتے، کہیں آئے کے کنٹر میں چند یتھنیاں، کوئی روٹی کتری ہوتی، کاغذوں کتابوں کی کسی الماری میں کترے ہوئے کاغذ بھسی کی چھوٹی سی ڈھیری کی صورت، پھر کبھی کبھی یوں ہوتا کہ ہم سوتے سوتے اچھل پڑتے تھے کوئی بد بدی چیز لحاف پر گرتی۔ سرسراتی ہوئی زمین پر اتر جاتی اور چیخ کی سی آواز پیدا ہوتی، پھر خاموشی چھا جاتی اور ایک چکچکا ہٹ کے احساس کے ساتھ ہم لحافوں میں دلکش پڑتے رہتے۔ پھر کسی کمرے میں آواز پیدا ہوتی جیسے کسی نے چلغوزہ کر کا۔ ایک چلغوزہ کر کا جاتا، پھر دوسرا چلغوزہ کر کا جاتا، پھر چلغوزے کلکنے کا تار بندھ جاتا۔ پھر یوں لگتا کہ چلغوزے نہیں کئے جا رہے، دو کہیں کسی درخت کے تنے پر آہستہ آہستہ آری چل رہی ہے۔

رات کے پردے میں درخت کے تنے پر آہستہ آہستہ آری چلتی رہتی اور رات لمبی ہوتی چلی جاتی صح اٹھتے تو یاد کئے پہنچتی رات ایک لمبا ذرا اوٹا معلوم ہوتی ہم دن کے کاموں میں لگ جاتے اور رفتہ رفتہ گزری رات آئی گئی بات ہو جاتی۔ مگر رات پھر آتی اور پھر درخت کے تنے پر دھیرے دھیرے آری چلتی پھر دن میں بھی آثار پیدا ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے کالونی کے ہر کوارٹر کے لان میں

بل بن گئے تھے۔ کسی بل میں دو بدر رنگ لبے بال سینگوں کی طرح اٹھے ہوئے اور دو آنکھیں چمکتی دکھائی دیتیں اور آن کی آن میں بل سے نکل کر باور پیچی خانے میں داخل ہوتا اور اجھل ہو جاتا۔ سیدانی جی آنکن میں رکھا ہوا المباہنس اخھاتیں اور کبھی باور پیچی خانے میں کبھی سامان کے کمرے میں کبھی سونے بیٹھنے کے کمرے میں جاتیں اور ایک ایک صندوق پر چھاتیں۔ پھر سیدانی جی تحکم گیکس۔ روٹی پکاتے پکاتے ان کی نظر نالی پہ پڑتی جہاں سینگوں ایسے دو بدر رنگ بال اور شیشہ ایسی آنکھیں چمکتی نظر آتیں۔ اور وہ اسی طرح روٹی پکاتی رہتیں۔ پھر آس پاس رکھے ہوئے برتوں میں سڑ پڑھوتی اور جب سیدانی جی مزکر دیکھتیں تو روٹی ڈلیا سے نکل کر گھستی گھستی نالی کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ وہ بے دلی سے اٹھتی اور روٹی اٹھا کر الگ مرغیوں کے لئے رکھ دیتیں۔ آنکھوں کے سامنے کبھی ایک ایک کبھی دو کبھی ایک پوری لینی ڈوری کمرے کمرے دوڑتی پھرتی رہتی اور وہ بیزار بیٹھی رہتیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے ان کی نظر لان کے کسی بل پر پڑتی اور ایک لمبی سی دم باہر نکلی دکھائی دیتی۔ انہیں لگتا کہ گرگٹ کی دم ہے اور جسم میں جھر جھری دوڑ جاتی اور اپنی جگہ پر جھی کی جی روہ جاتیں کوارٹر انہیں میلا میلا اور برتن بھانڈے بخس نظر آتے، دیگھیوں، رکابیوں اور پیالوں کو وہ راکھ سے خوب مانگتیں؛ پانی کے تزویرے دیتیں؛ تمدن دفعہ پاک کرتیں اور پھر بے اطمینانی رہتی۔ کمروں کے فرش کو جمع کے جمود ہوتیں۔ بالیاں کی بالیاں پانی کی بہاتیں اور اس کے باوجود اب وہ گھر کے پکے فرش پر نگے پیرنیں پھرتی تھیں۔ سیدانی جی پر موقوف نہیں ہم سب کی سبکی حالت ہو گئی تھی۔ مولوی عثمان علی نے جوان دنوں کلام پاک اور انجیل اور قصص الانبیاء کے حوالے سے پرانی امتوں کے قصے بہت سناتے تھے آل فرعون کے عذاب کا قصہ سنایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون سے کہا کہ دیکھ میں تیرے ملک کی سب اطراف کو مینڈکوں سے بھر دوں گا اور دریا بے شمار مینڈک پیدا کرے گا اور وہ اوپر آ کے تیرے گھر میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیری تنوروں میں اور تیرے آٹا گوند ہنے کے لگنوں میں داخل ہوں گے اور مینڈک تجھ پر اور تیری رعیت پر اور تیرے سب تو کروں پر چڑھیں گے۔ قصہ سن کر ہمیں عجب گلگجاہٹ کا احساس ہوا۔ بعد میں یہ گلگجاہٹ ہمارے احساس کا حصہ بن گئی۔ ہمارے حواس میں رس بس گئی۔ اجازہ زمینوں کے اور عذاب سے تباہ شہروں کے گرد سے ائے رخنے اور نجاست سے بھرے سوراخ کھل گئے تھے اور چوہے نکل نکل کر ہمارے گھروں میں ہماری آرام گاہوں میں ہمارے بستروں میں ہمارے چولہوں اور تنوروں اور آٹا گوند ہنے کے لگنوں میں داخل ہو رہے تھے ہم پر گلگجاہٹ طاری تھی۔

سیدانی جی کو اکثر امریکہ والے پر اور کبھی کبھی محض پر غصہ آتا۔ روز پانچوں وقت کی نماز کے بعد وہ محض کے امریکہ جانے اور اپنے کر بلاۓ مععلی جانے کی دعا کیں کرتیں۔ روز ہم منور میڈیا نکل شور پر بیریم کار بونیٹ کی بیٹھی کا پتہ لینے جاتے۔ روز ہمیں ناکام واپس

ہوتے دیکھ کر مولوی عثمان علی مایوسانہ انداز میں سر کو جنبش دیتے اور خبردار کرتے کہ جب تک مسلمان اپنے اعمال کی اصلاح نہیں کریں گے۔ بیریم کاربونیٹ سے کوئی نتیجہ نہیں لٹکے گا۔ پھر وہ واعظانہ لہجے میں قصہ سناتے ان امتوں کے جن کی کھیتیاں مٹیاں چاٹ گئیں، ان شہروں کے جنہیں سیلابوں نے آلیا۔ ان بستیوں کے جن کے باسی جوں بدل کر آدمی سے بندربین گئے۔ روزہم وہی قصہ سنتے اور وہی باتیں کرتے ان قصور اور باتوں سے ہم بیزار ہو جاتے اور پھر وہی قصہ سنتے اور وہی باتیں کرتے دنوں کا فرق ختم ہو گیا۔ ہر نیا دن وہی پر اتنا دن اور ہر صبح وہی پچھلی صبح ہوتی۔ دنوں کے رنگ اور راتوں کی رنگارانگی جاتی رہی لگتا کہ زمین کیلی پر گھونٹے گھونٹے رک گئی ہے اور سب کچھ ٹھہر گیا تھا۔ بیریم کاربونیٹ کا گیا ہوا آرڈر بچلی کا آیا ہوا سلسلہ پکی بنتی ہوئی سڑک اور خود ہم ہمارے احساسات اور عمل بچلی ہماری کالوں میں اب آگئی تھی اور بڑی سڑک پکی بن گئی تھی مگر جو رستے کچھ رہ گئے تھے اور جو کوارٹر ادھ بنتے کھڑے تھے وہ لگتا تھا اور جہاں بچلی کے سمجھے تاروں اور چینی کی گلکوں کی آرائش سے محروم کھڑے تھے وہ لگتا تھا کہ کالوں کی تغیر کے نقشے کا حصہ ہیں کہ اب ان کی صورت بیہی رہے گی۔ حرکت کو تصور میں لانے کے لئے ہم اپنی کالوں سے پرے اس شیشا ایسی چمکتی کالی سایہ دار سڑک کو دیکھتے جہاں تھوڑے تھوڑے وققے کے بعد بس شور کرتی ہوئی گزرتی اُسے رکتے اور گھرائی کے ساتھ چلتے دیکھتے تو جانتے کہ دور بلندی پر کوئی الگ دنیا ہے جہاں ہر چیز روشن اور روائی دوائی ہے اور کبھی کبھی عجب خیال آتا کہ اشرف چاچا گھیز کے دفتر کا چکر لگانے کے بعد واپس آئیں گے تو ہماری بدلتی ہوئی صورتیں دیکھ کر ہمارے چیاں ایسی آنکھیں اور منہ پر سینگوں کی طرح اٹھے ہوئے بدرنگ بال دیکھ کر ششدرا رہ جائیں گے اور ہر اساد پریشان واپس ہو کر پھر بس میں سوار ہو جائیں گے۔ اور پھر ہم سوچتے کہ کیا چکر انابھی چل سکتا ہے کہ آدمی مکانوں کو چھوڑ کر درختوں پر بسرا کرنے لگے اور درختوں سے اتر کر بلوں اور سوراخوں میں رہنے لگے۔ ہمارے سوچنے کی بھی ایک ڈگر مقرر ہو گئی تھی، ہر پھر کروہی باتیں سوچتے تھے اور وہی کیفیتیں محسوس کرتے تھے۔ بس ذہن کے اندر ایک دائرہ سا بن گیا تھا اور خیالات کی چکلی اسی چلتی رہتی تھی اب تورات اور دن بھی سیاہی اور سفیدی کا دائرہ تھے۔ رات ابتداء ہوتی تو ختم ہونے میں نہ آتی اور دور درخت کے تنے پر آری لگا تار دھیرے دھیرے چلتی رہتی اور پھر آس پاس کبھی پنگ کے نیچے کبھی لحاف کے اوپر کوئی بد بدی سی چیز سرسراتی اور آنا فانا گم ہو جاتی اور ہم پر یہ گنجائش طاری ہوتی کہ دم رکنے لگتا۔ بدرنگ جگہی رات رینگتی رہتی رینگتی اور آخر پھیکی پڑنے لگتی اور آسمان پر اجائے کی لکیردم کی طرح رینگتی ہوئی پھیلتی، خدا دکا کر کے دن لٹکتا اور ہم اپنے بلوں سے نکلتے اور انہیں روزمرہ کے رستوں پر رینگنے لگتے۔ پکی سڑک اب پکی نہیں لگتی تھی، اور کچھ راستے زیادہ کچھ دکھائی دیتے تھے اور کیا کچھ رستے ہر روٹ خاک اڑتی رہتی اور ہمارے کوارٹر جو بر سات سے پہلے تک اجلے اجلے تھے اب میا لے میا لے نظر

آتے اور لگتا کہ آہستہ آہستہ بیٹھتے جا رہے ہیں کہ کسی رات وہ نیچے دھنس جائیں گے اور صبح کو ہم پنجوں کے بل سکر کرو شندانوں کی راہ  
ریگنے ہوئے لکلے گے۔

خیالات کے اس ریگنے والے کو بیریم کاربونیٹ نے توڑا۔ بیریم کاربونیٹ سچ مجھ آگئی۔ جب یہ خبر ملی ہے کہ بیریم کاربونیٹ  
کی بلٹی آگئی ہے تو کچھ نہ پوچھو کر کیا حال ہوا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ کیلی پر تھہری ہوئی زمین پھر یا کیا یک گھونٹے لگی ہے جس کو اڑواں کے  
دیکھو منور میڈ یکل سور کی طرف چلا جاتا ہے جب ہم وہاں پہنچے ہیں تو ایک جمع جمع تھا اور ڈاکٹر منور کہہ رہے تھے ”بیریم کاربونیٹ ختم  
ہو گئی۔“

ہم نے اشرف چاچا سے کہا ”اشرف چاچا بیریم کاربونیٹ بھی بلیک میں چل گئی۔“  
اشرف چاچا غصے میں بھرے جمع کو چیرتے ہوئے سور میں داخل ہوئے۔ ترخ کر بولے کہ ”ایک دن میں ختم ہو گئی آج بلٹی آئی  
ہے، آج ہی ختم ہو گئی۔“

ڈاکٹر منور نے سکون سے جواب دیا ”بات یہ ہے کہ رام گڑھ کے زمینداروں نے لمبے آرڈر بک کر ارکھے تھے۔“  
رام گڑھ کے زمینداروں نے اشرف چاچا اسی غصے سے بولے ”آپ نے میڈ یکل سور کا لونی والوں کے لئے قائم کیا ہے یا رام  
گڑھ کے زمینداروں کے لئے مصیبت ہم پر آئی ہوئی ہے، بیریم کاربونیٹ رام گڑھ کے زمیندار لے گئے۔“

”اشرف چاچا۔ وہاں زیادہ مصیبت آئی ہوئی ہے۔“  
”کیا مصیبت آئی ہوئی ہے۔“

”رام گڑھ کے کھیتوں میں چوہا آگیا ہے۔“

”رام گڑھ کے کھیتوں میں..... میں..... چوہا.....“ اشرف چاچا کا منہ کھلا کا کھلا رہا گیا۔

ڈاکٹر منور اطمینان سے کری پر بیٹھا اور فاؤنسٹین پین نکال کر لکھنا شروع کر دیا۔ اشرف چاچا پٹھائے سے کھڑے رہے پھر دکان  
سے نیچے اترے اور کھوئے کھوئے سے چلنے لگے دیکھتے دیکھتے جمع چھٹ گیا اور منور میڈ یکل سور کے سامنے کی مرک بالکل خاموش  
ہو گئی۔ اشرف چاچا منور میڈ یکل سور سے نواکی دکان پر پہنچے۔ وہاں یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ مولوی عثمان علی خاموش حقہ پی رہے  
تھے۔ نواکیں تک رہا تھا۔ اشرف چاچا بھی مونڈھا گھسیٹ کر خاموش بیٹھ گئے۔

نوا بولا ”اشرف چاچا میر اتوکل ہی ما تھا تھک گیا تھا۔ جب رام گڑھ سے گھی والا آیا تو کہنے لگا کہ تم شہروں والوں نے ہمیں بھی یہماری

لگادی۔"

نصر و میں ساز جو اشرف چاچا کو سنجیدگی سے چلتے دیکھ کر ساتھ گلگ گیا تھا بولا" کہتے ہیں جی کہ بہت چوہا آیا ہے۔" اشرف چاچانے کوئی جواب نہیں دیا۔

مولوی عثمان علی نے حق کی نے کو ایک طرف کیا۔ بولے "اللہ مسلمانوں پر رحم کرے" چپ ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑے کچھ سوچتے رہے پھر فرمایا "جب آدمی کے حصے کا رزق دوسری مخلوق کھا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ عذاب آگیا۔"

اشرف چاچا اس پر بھی کچھ نہیں بولے۔ مولوی عثمان علی چپ بیٹھے رہے زمین کو تکتے رہے پھر انھوں کھڑے ہوئے "اللہ رحم کرے" اور اپنے گھر کو ہولے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہم میں سے کوئی بھی تو کچھ بات نہیں کر سکا بس گم میٹھے رہے پھر ایک ایک کر کے گھر چلے گئے۔ وہ رات بھی بھاری گزری۔ سیدانی جی کہتی ہیں کہ رات بھرا لسی آواز آتی رہی جیسے پانی کی بھری مشکل کوئی کتر رہا ہے۔

دوسرے دن جب ہم جا گئے تو سیدانی جی کو چلاتے سنا کہ "کجھت نوا کے طاعون کی گلٹی نکلے۔ بے ایمانی پ کمر باندھ رکھی ہے۔ آخر کل بھی تو میں نے اسی کے سے اڑ دکی دال منگائی تھی مٹے نے ایک دن میں اگئے سے دو گناہ جاؤ کر دیا۔"

سیدانی جی کے احتجاج کے باوجود اڑ دکی دال اور اڑ دکی دال کے ساتھ دوسری دالیں اور دالوں کے ساتھ دوسری چیزیں مہمگی ہوتی چلی گئیں۔ اور سیدانی جی نے اعلان کر دیا کہ "تابھیا میں تیرے امریکہ والے کا کب تک انتقام کروں۔ میں اب یاں نہیں رہوں گی۔" اس اعلان کے باوجود سیدانی جی ابھی تک کر بلائے معلی نہیں جا سکی ہیں اور محسن جیسے چوہے داں میں کوئی چوہیا پھنس گئی ہوا اور نکلنے کے لئے بے قرار ہو روز کا لوٹی سے شہر جاتا ہے اور اثر و یود بتاتا ہے مگر ابھی تک وظیفے کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔



## سمجھوتہ

یہ خبر آگ کی طرح پھیلی کہ ڈھموں آپا کی لونڈیا لا ہور کے بڑے شفاخانے میں دائی ہو گئی ہے۔ رقیہ خالدہ اور اختری نے اس پر بہت کوس کٹانی کی لیکن جو خبر ایک دفعہ تکلیفی ہو کہیں دبا کرتی ہے۔ رقیہ خالدہ نے تو خیر آخوند تک اس امکان سے انکار کیا کہ ان کے خاندان کی کوئی لڑکی تو کری بھی کر سکتی ہے۔ مگر اختری نے واقعات شواہد کو پے در پے اپنے خلاف جاتا دیکھ کر اپنے موقف کو کسی قدر بدلتا یا اور یہ کہا کہ ”لبی بی کہنے والیوں کا کیا ہے دائی کہہ دیں مگر ہماری لونڈیا تو ڈاکٹرنی ہی ہے۔ آکر گلے میں ڈال کے شفاخانے جاوے ہے اور اللہ نظر بد سے بچاؤے اگلے برس تک سول سرجن ہو جائے گی۔“

نفحی چھپی نے جب یہ سنا تو بولیں کہ ”اری ہم کوئی کسی کا برا چاؤں ہیں۔ اللہ کرے ڈاکٹرنی ہی بنے۔ مگر میں نے تو اسی کی بات زبان سے دھرا تھی اپنے دماغ سے تھوڑا ہی اتنا رہی ہے۔“

نفحی چھپی کا یہ بیان درست تھا، انہوں نے اپنی اطلاع خود نزہت سے حاصل کی تھی، یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کے روزمرہ اور اجنبی میں ڈھلن کر کسی قدر بدلتی تھی۔ وہ پچھلے دنوں لا ہور گنس کو تو داتا صاحب جاتے ہوئے جب بس گنگارام ہسپتال پر رکی تو لڑکیوں کے ایک چڑھتے ہوئے سیلا ب میں نزہت کو انہوں نے فوراً شناخت کر لیا ”اری تو ڈھموں کی لونڈیا ہے نا؟“

نزہت نے کسی قدر سپشا کر چھپی کو دیکھا، پھر فوراً آداب بجا لائی ”نفحی چھپی آداب۔“

”جیتی رہ بیٹی!“ دعا دیتے دیتے نفحی چھپی نے اوپر سے نیچے تک کا جائزہ لیا اور بولیں ”ماشاء اللہ سیافی ہو گئی ہے۔ میری تو پیچان میں نہ آئی۔ پھر انہوں نے کئی بار آنکھیں مچکا کر سینے کے درمیان سچ ہوئے پٹی جیسے دو پٹے کو دیکھا اور بولیں ”بیٹی گلے میں پٹی ڈالنے کا یہ کوئی نیا فیشن ہے؟“

نزہت نے اس بے تکلفانہ تبصرے کو بظاہر بالکل نظر انداز کر دیا اور سادگی سے کہا ”چھپی یہ دو پٹے ہے۔“

”دو پٹے؟“ نفحی چھپی کسی قدر حیران ہو کر بولیں ”بیٹی دو پٹے تو سینے اور سر پر ڈاکٹر جاوے ہے۔“

اس سرسری ملاقات میں نزہت نے انہیں یہ اطلاع دی تھی کہ وہ نر سنگ کا کورس کر رہی ہے۔ نفحی چھپی نے نر کو بے تکلف اپنی زبان میں ترجمہ کر کے دائی بتالیا اور یہ بیویوں میں بینچہ کر سخت حیرت کا اظہار کیا ”لبی بی ہمارے زمانے میں تو دایاں ملی ولی رہوئے تھیں۔ مگر لا ہور میں تو قیامت نوٹ رہی ہے۔ شریفوں کی بیٹیاں دائی بن رہی ہیں اور تیتوں کی طرح یوں اڑی پھرے ہیں۔“

لاہور کی عمومی اخلاقی حالت پر تبہرہ کرتے کرتے انہوں نے چھموں آپا کی بیٹی کا ذکر چھیڑا "اللہ تو بڑی اچھال چھکا ہے۔ اتنی سی اونڈیا قمیض شلوار میں پچھنی پڑے ہے اور قمیض وہ کاہے کو تھی حراف نے جملی بدن پر منڈھر کھی تھی۔"

نئی چھی کے ہنوں سے نکلی کوئھوں چڑھی بات گھر گھر پھیل گئی۔ کہنے والیوں نے رقی خالہ اور اختری کے مند پر بھی کہا۔ رقی خالہ بہت بگڑیں "یہ بیو! جوان لڑکیاں سب کے آگے ہیں کس کی بیٹی کو یوں بدنام نہیں کیا کرتے۔"

لیکن ہربی بی نے اپنی صفائی پیش کر دی اور آخر میں یہ بات کھلی کہ یہ سب آگ نئی چھی کی لگائی ہوئی ہے۔ اختری نے فوراً جوابی حملہ کیا اور وہ بھی تو لاہور رہ کر آئی تھی۔ یہ آفت کی پڑیا بڑھیا اپنی نواسیوں کی ذرا خبر لے۔ کالج میں انہوں نے کیا آفت بور کی ہے۔ ہراونڈے سے رفعت پر پچ کرتی پھریں ہیں۔"

مگر چھموں آپا کی بیٹی کی بات اس وقت اتنی گرم تھی کہ جوابی حملہ زیادہ کارگرنہ ہو سکا۔ رقی خالہ اور اختری دونوں نے نئی چھی سے حصہ بخرا بند کر دیا یہاں تک کہ پوتا ہونے کی مبارکباد دینے بھی نہیں گئیں۔ چھموں آپا کو فوراً بذریعہ خط سارے حالات سے مطلع کیا گیا چھموں آپا کا جواب بھی آگیا۔ مگر ان کا خط عجب طرح کا تھا کہ نئی چھی کی اطلاعات کی اس سے نہ تو تائید ہوتی تھی اور نہ تردید ہوتی تھی۔ رقی خالہ اگلے ہی صینے بہن سے ملنے لاہور گئیں بھائی کے بارے میں یہ خبر تو بہر حال غلط لگلی کہ وہ داتی بن گئی ہے مگر اس کی چنک ملک دیکھ کر وہ بھی دسوے میں پڑ گئیں۔ لاہور سے واپسی پر انہوں نے نئی چھی کے بیانات کی تردید ضرور کی مگر اب ان کے لہجے میں وہ پہلے والا اعتماد نہیں رہا تھا۔ بلکہ اختری سے تو انہوں نے خفیہ خفیہ صاف کہہ دیا کہ "چھموں آپا کسی دن سرپکڑ کے رو دیں گی۔ لڑکی کے چھن اچھے نہیں ہیں۔"

واقع یوں ہے کہ رقی خالہ نئے طور طریقوں کو کسی صورت برداشت نہیں کرتی تھیں جب ان کے گلو نے پہلی بار رنگ پتلون پہننا تھا تو انہوں نے صاف نوش دیدیا کہ "حرام کے جنے پھر میں نے تجھے یہ بندوق کی کرتی پہنچ دیکھی تو ناگھیں توڑ دوں گی۔" اور گلو نے میئنے بھرتیک واقعی اس پتلون کو نہیں پہننا۔ گلو نے نئی زندگی کا آغاز کو کا کولا سے کیا تھا۔ اس نے یہ سخن بڑے جتنی سے معلوم کیا تھا کہ کوکا کولا میں اگر اسپروکی دو گولیاں گھول لی جائیں تو وہ شراب بن جاتی ہے۔ کوکا کولا کی پہلی بوتل اس نے اسی نسخے کے ساتھ پی تھی اور اسے واقعی یوں لگا کہ اس نے شراب پی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اسپروکی گولیوں کے گھولنے کے باوجود کوکا کولا کا نشر غائب ہو گیا۔ بس اب اسے ایک عادتی ہو گئی تھی کہ چار قدم چل کر کسی دکان پر رکا، کوکا کولا کی بوتل لے کر منہ سے لگائی اور غنا غاثت پی ڈالی اور گھرے سرخ رنگ کے چارخانے والی قمیض چست پتلون کے ساتھ وہ بیٹھک میں چھپ کر پہنتا اور چپکے سے باہر نکل جاتا۔ کسی کسی دن رقی خالہ

دیکھ لیتیں تو گھر کے بہت بارے پھوڑتیں۔ مگر رفتہ رفتہ ناگہیں توڑنے کی دھمکی ڈھمکی پڑ گئی اور رقیہ خالہ نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ لڑکوں کا کیا ہے آوارہ بھی ہو جائیں تو کچھ نہیں بگزتا۔ نازک معاملہ تو لڑکی کا ہوتا ہے۔

اور رقیہ خالہ کی لڑکی بھی اب ماشاء اللہ بڑی ہو چلی تھی سیانی ہوتی ہوئی لڑکی کا عالم عجب ہوتا ہے۔ آج جو کچھ ہے ڈھیلے ہیں وہ چھینوں کے اندر اندر جسم پر پھٹنے لگتے ہیں۔ کم از کم رقیہ خالہ نے فروکی دن دن تک ہوتی قمیض کی شروع میں یہی توجیہ کی تھی مگر فروکا جسم بڑھ رہا تھا اور قمیض کا گھیر کم ہوتا چلا جا رہا تھا اور جب سے وہ رقیہ خالہ کے ساتھ لا ہو رکا چکر لگا کر آئی تھی تو نزہت آپا سے بار بار یاد آتی تھیں اور اب اس کی قمیض کا پہلو والا نیچے کا ٹیک بٹن کھلانے لگا تھا۔ رقیہ خالہ نے اس بے شرمی پر اسے کہی بار بار کبھی تھا اور ہر بار اس نے پٹپٹا کر بند کر دیا تھا۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ پہلو میں ٹیک کے بٹنوں کی گنتی بڑھتی چلی گئی اور ایک کی جگہ دو بٹن کھل رہے ہے لگے۔ ٹیک کے دو بٹن ہر دم کھل رہتے اور اجلا اجلا پنڈا مستقل جھلکتا رہتا اور اپنے بھرے بھرے بچھائے کے ساتھ فروادی لگتی جیسے بالکل جوان ہو گئی ہے۔

میرک کا امتحان ختم ہو چکا تھا اور اب فروکی چھٹیاں شروع تھیں اور اسے اس قصباتی فضائیں سخت بوریت ہو رہی تھی اور رقیہ خالہ کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ لڑکی پڑھ لکھ کے بڑی ہو گئی۔ اب اسے گھر میں کب تک بخایا جائے۔ جب وہ اس مسئلہ پر سوچنا شروع کرتیں تو سچتی ہی چلی جاتیں اور رات گئے تک جا گئی رہتیں۔

بور ہوتے ہوئے فروپڑ نزہت آپا سے ملنے کا دورا پھر پڑا۔ اور رقیہ خالہ نے سوچا کہ لڑکی کا جی اور سا ہو جائے گا۔ چھٹیوں میں خالہ کے پاس چلی جائے تو کیا معاشرت ہے۔

میرک کا نتیجہ اس وقت آیا جب فرولا ہور میں تھی اور نزہت نے خالہ جان کو ایک خط میں نرنسگ کو رس کی تفصیلات اور فائدے لکھے۔ رقیہ خالہ پہلے اس خط پر برہم ہو گیں۔ ”دیکھو اس لوئڈ یا کو جیسی خود حرافہ ہے ویسی ہی میری لوئڈ یا کو بنا ناچاوے ہے۔“ مگر پھر بڑھی ختم ہو گئی اور وہ سوچ میں پڑ گئیں اور پھر انہوں نے شہنشاہ انس بھر کے اختری سے کہا کہ ”بھی بڑے بڑے لوگ اپنی بیٹیوں کو تو کریاں کر رہے ہیں۔ ہماری کیا اوقات ہے۔“

اور فروج عید کی چھٹیوں میں گھر آئی تو اس کی قمیض کا گھیر نزہت کی قمیض کے گھیرے سے بھی چھونا تھا اور سر کے بال کپٹھی تک رہ گئے تھے۔ رقیہ خالہ کو یہ بات اچھی نہیں لگی مگر ساتھ ہی انہیں یہ محسوس ہوا کہ ان کے سر پر بینی کا جو منوں بوجھ رکھا ہوا تھا وہ اتر گیا ہے۔



## آخری خندق

اس روز بھی کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ پیش کار صاحب روز کی طرح اس روز بھی گزرتے گزرتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے کھڑے ہو گئے مگر کوئی ایسی لمبی چوڑی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ لمبی چوڑی باتیں تو جنگ کے دنوں میں ہوا کرتی تھیں۔ پیش کار صاحب گزرتے گزرتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے پڑھکتے اور کہنے لگتے۔ ”مرزا صاحب رات تو بہت توپ چلی ہے۔“

مرزا صاحب حقہ پیتے پیتے حقد کی نے الگ کرتے اور کہتے ”میرے خیال میں تورات پھر چلی ہے۔ میں بارہ بجے کے بعد سو یا مگر آنکھ لگلی تھی کہ پھر کھل گئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ زلزلہ آ گیا ہے۔“

”ہاں صاحب پکھو لے مباہی کام ہوا ہے رات۔“

”میرا خیال یہ ہے پیش کار صاحب کا اپنے شیر امر تر پہنچ گئے۔“

”اماں نہیں۔“

”مت انوجی۔ آجائے گی کل تک خبر۔ خود پتہ چل جائے گا۔“

یوں ان روزوں بھی پیش کار صاحب مرزا صاحب کی رایوں سے کچھ بہت زیادہ اتفاق نہیں کرتے تھے مگر اس کے باوجود آپس میں مفاہمت تھی۔ کشیدگی تو اس کے بعد شروع ہوئی ہے اور عجب طرح سے شروع ہوئی۔ مگر خیرذ کر تو اس روز کا ہے۔ اس روز تو پیش کار صاحب نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ بات تو بس ایک ہی کہی تھی جو روز رستہ چلتے چلتے کہا کرتے تھے اور رستہ چلنے کا پیش کار صاحب کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ بات یہ ہے کہ پیش کار صاحب اب خاصے عرصے سے ریاڑ چلے آتے ہیں۔ مگر وہ جو صبح صح گھر سے تیار ہو کر نکلنے کی عادت تھی وہ قائم ہے۔ اب وہ کچھری نہیں جاتے تو ڈاکٹر صاحب کی دکان پر جاتے ہیں اور جب تک دو پھر نہیں ہو جاتی اور ڈاکٹر صاحب دکان سے اٹھنے نہیں لگتے وہ ہاں مستقل ڈائیسٹریٹ بیٹھ رہتے ہیں اور مرض کے بہانے اور بے بہانے آنے والوں سے سیاست پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ خیر بیٹھ کر ہی گفتگو کریں۔ مگر انہیں تو باتیں کرنے کا ایسا اپکا ہے کہ چلتے چلتے کسی بھی نکڑ پر کھڑے ہو جاتے اور کسی کو روک کر باتیں کرنے لگتے ہیں تو کبھی اس نکڑ پر کھڑے ہو جانا کبھی اس نکڑ پر پڑھک جانا۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا۔ رستے میں مرزا صاحب کا کوارٹر بھی آتا تھا تو مرزا صاحب کو برآمدے سے باہر احاطہ میں بیٹھا دیکھاں

سے بھی ڈیڑھ بات کر لیا کرتے تھے اور اس روز بھی ڈیڑھ ہی بات ہوئی تھی۔ رہائش پر اعتراض تو خندق پر پیش کار صاحب کو اعتراض اسی روز سے چلا آرہا تھا جس روز سے انہوں نے اپنی خندق پٹوائی تھی۔ خندق میں اس کا لونی میں اچھی خاصی تعداد میں کھدی تھیں۔ اور ایک خندق تو خود پیش کار صاحب ہی کی تجویز پر کوارٹروں کے سامنے والے اس میدان میں بھی کھدی تھی جہاں لڑکے بارہوں مہینے کر کت کھیلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ کے بعد یہی خندق سب سے پہلے زد میں آئی۔ فائزہ بندی کے تیرے ون لا لو مہترانی اپنا توکر اس خندق میں الٹ گئی۔ پیش کار صاحب نے گزرتے گزرتے جب خندق کو یوں خراب دیکھا تو انہوں نے بہت شور مچایا۔ لا لو مہترانی اس دن تو دہل گئی تھی بلکہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ دہل ہوئی رہی مگر اس کے بعد اس نے الکاہٹ میں دور جانے کی بجائے پھر وہاں اپنا توکر الٹ دیا۔ اس بارکسی نے اس پر توجہ نہ کی۔ اس نے دوسرے دن بھی اپنا توکر اوپر ہیں الٹا اور دوسرے دن بھی کسی نے دھیان نہ دیا۔ اور اب تو دھیان دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ خندق کوڑے کر کت سے لبال بھر چکی ہے بلکہ اب تو اونچی ہو گئی ہے۔ آس پاس کے کوارٹروں کی مرغیاں ہر پھر کراس مقام بلند پر آتی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی مرغاً گردن پھلا کر کچکچا کر کسی مرغی پر سوار ہو جاتا ہے پھر اپنے پہلے ہوئے پنجوں سے زور زور سے کوڑے کو کریدتا ہے اور بازوں پھینکھلا کر بہت زور سے بانگ دیتا ہے۔ مرغیوں کے پر یہاں خاصے ہی بکھرے پڑے ہیں اور ایک دن تو یہاں ایک مری ہوئی ہی بھی پڑی ہوئی تھی۔ خیر وہ تو دوسرے دن ہی کوڑے کی گاڑی آنے پر اٹھ گئی تھی مگر جنگ کے دنوں میں یہ خندق کتنی صاف ستھری تھی۔

ویسے دوسری خندقوں کی یہ صورت نہیں ہوئی۔ دوسری خندق میں بھی تو کوارٹروں کے اندر۔ یہ سب کوارٹ ایک جیسے ہیں۔ آگے مختصر سا برآمدہ۔ برآمدہ کے آگے مختصر سالان۔ لان کے آگے پست دیوار جنگ کے دنوں میں یہ خندق کتنی صاف ستھری تھیں اور تازہ کھدی ہوئی مٹی سے کیسی سوندھی سوندھی خوشبو لکھتی تھی۔ اب یہ سوندھی سوندھی خوشبو کہاں۔ اب تو انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ صد یوں پہلے یہاں کوئی جنگ ہوئی تھی اور خندق میں کھدی تھیں۔ اب خندق میں نہیں ہیں۔ خندقوں کے آثار ہیں۔ سو کچھ زرد پتے، پھٹی ٹوٹی پتھریں، کبوتروں کے باہی پر سرکندوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، کوئی ٹوٹی پھوٹی شیشے کی بوتل، کوئی زنگ آلو دیمن کا ڈبہ، کوئی پچکی ہوئی سگریٹ کی ڈبی، کوئی ترا مڑا لیڈی شو، کوئی مٹی میں رلامالایر لیر دوپٹہ، کوئی صحیح سلامت انڈ رویہ۔ کبھی میں نہیں آتا کہ یہ انہل بے جوڑ چیزیں خندقوں میں کن کن راستوں سے پہنچیں اور اب ہر خندق آثار قدیمہ کی روایت کا حصہ نظر آتی ہے۔ پہلی کوئی والوں نے اچھا کیا کہ فائزہ بندی ہوتے ہی اپنی خندق پٹوادی۔ یوں تو اس کا لونی میں کوارٹر ہی کوارٹر ہیں مگر اکا دکا کوئی بھی ہے ہی اور پہلی کوئی والے تو بہت معزز لوگ ہیں۔ ان کے دنوں بیٹے بڑے عہدوں پر فائزہ ہیں۔ تیرا اپنا وظیفہ پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ فائزہ بندی کے دوسرے ہی

دن انہوں نے ڈرائیور سے کہا کہ کار کو اپنے چلوا لوا اور مالی کو بلوک کر کہا کہ لان بہت بر الگ رہا ہے خندق کو پاٹ دو۔ مگر ذکر تو مرزا صاحب کی خندق کا تھا جسے وہ پٹوانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دوبارہ جنگ کے جو منتظر تھے خود پیش کار صاحب ہی اپنی خندق کب پٹوانا رہے تھے۔ بس اچانک ہی ان پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ ہوا کیا کہ ایک روز صبح مجھ جب وہ گھر سے نکلنے لگے تو برآمدے میں تھے کہ انہیں خندق سے کچھ کھسر پھسر کی کچھ سانسوں کی آواز سنائی دی۔ وہ مجس سخندق کی طرف بڑھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ دو لاکے اچک کر خندق سے نکلے اور تیر ہو گئے۔ پیچھے رہ جانے والے گورے چٹے لاکے کا پامجامہ تھوڑا سا کھسک چلا تھا اور کمر بندز میں میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ اس نے سڑک کے پیچے رک کر پامجامہ کو اپر اکسایا، کمر بند کو نیفے میں ٹھونسا اور پھر ایسا تیز دوڑا کہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوچھل ہو گیا شاید اس روز ڈاکٹر صاحب کی دکان پر کسی جگہی مریض سے جو خود کو سیاسی امراض کی تشخیص میں ماہر جانتا تھا پیش کار صاحب نے سینڈر اونڈ پر لمبی ہی بحث کر دی۔ جب دو پھر کو واپس ہوئے تو تھوڑے سے جھلانے ہوئے تھے۔ انہوں نے برآمدہ بنائی کرنے کا نظر رکھ لیا۔ اب کوئی لڑکا یہاں قدم نہ رکھے۔ حرامزادے اور پیش کار صاحب منہ ہی منہ میں بڑھ رہے ہوئے اندر چلے گئے۔

دوسرے دن پیش کار صاحب گھر سے نکل تو چلتے چلتے مرزا صاحب کے کوارٹ کے سامنے جمع ہوئے کہنے لگے "مرزا صاحب نے تو خندق پٹوانی ہے تم بھی پٹوانا دو جنگ اب نہیں ہو گی۔"

مرزا صاحب کو یہ مشورہ پسند نہیں آیا مگر پیش کار صاحب دوسرے دن گزرتے ہوئے پھر رکے۔ خندق کو غور سے دیکھا اور پھر بولے "مرزا صاحب مان جاؤ جی، بہت ہو گئی۔ خندق اب پٹوانو۔"

مرزا صاحب نے مشورے کو پھر رد کر دیا۔ تیسرا دن پیش کار صاحب گزرتے گزرتے رکے۔ مشورہ تو انہوں نے کوئی نہیں دیا۔ بس حیرت سے خندق کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے "کمال ہے، ابھی تک خندق کھدی ہوئی ہے۔"

مرزا صاحب نے اس مرتبہ تو جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خاموشی سے حق پیتے رہے اور پیش کار صاحب کو سنتے رہے۔ پیش کار صاحب نے خندق کو تھوڑی دیر تک بنظر حیرت دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب زیادہ بحث نہیں کرتے۔ شاید اس لئے ان کی اور پیش کار صاحب کی گفتگو کبھی لمبی نہیں کھلی اور کبھی نہ دیکھا کہ پیش کار صاحب احاطہ میں آ کر بیٹھے ہوں اور اطمینان سے باتیں کی ہوں۔ ہمیشہ بھی دیکھا کہ پیش کار صاحب چلتے چلتے رکے۔ ایک بات ادھر سے ہوئی ایک بات ادھر سے

ہوئی اور آگے بڑھ گئے دونوں ہی کو وضعدار دیکھا۔ مرزا صاحب نے کبھی اندر آنے اور بیٹھنے کی دعوت نہیں دی۔ پیش کار صاحب کبھی اندر احاطہ میں آ کر بیٹھنے نہیں مگر ان کا اب یہ روزمرہ کا معمول بن گیا تھا کہ گزرتے گزرتے رکتے اور کہتے کہ ”مرزا صاحب مان لو ہماری بات۔ خندق اب پشاوادو۔“

اس مشورے نے مرزا صاحب پر کبھی اشتبہ نہیں کیا۔ انہوں نے خندق کو اس طرح صاف ستر ارکھا جس طرح جنگ کے دونوں میں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ضرور ہوا تھا کہ آس پاس کے کوارٹروں کے دونتھ لڑکے خندق کے کنارے آکھڑے ہوئے اور اپنی اپنی دھار کا مقابلہ کرنے لگے۔ مگر مرزا صاحب نے تنست موقع پر انہیں دیکھ لیا۔ وہ نٹ کھٹ لڑکے بھاگ لئے اور مرزا صاحب لاومہترانی کو بلا کر لائے۔ اس نے نیچے اتر کر گلی مٹی کو کھرچ دیا اور خندق پھر پاک و صاف ہو گئی۔ ایک دفعہ اس میں یہی نٹ کھٹ لڑکے ایک گلی کے پیچے کو بھی دھکیل گئے تھے اور وہ کئی گھنٹے اس میں گراپڑ امیاؤں میاؤں کرتا رہا۔ خیر جب مرزا صاحب نے اسے باہر نکالا تو وہ ضرور مٹی میں اٹ گیا تھا۔ مگر خندق کی مٹی اس کے گوموت سے خراب نہیں ہوئی تھی۔ البتہ برابر کے کوارٹر کی اس چھٹی گلی نے تھوڑی خرابی ضروری کی تھی جو رات کے اندر ہیرے میں جانے کہاں سے ایک کبوتر منہ میں دبوچ کر اس خندق میں اتری اور سارا کبوتر چٹ کر کے پیچے پر اور سروہاں چھوڑ گئی۔ صبح کو جب مرزا صاحب نے خندق کا یہ احوال دیکھا تو خود اس میں اترے اور بڑی احتیاط سے ایک ایک پر چین کر خندق سے باہر پھینکا مگر کبوتر کے پروں اور پنجوں سے خندق خراب تو نہیں ہو سکتی تھی۔ خراب تو وہ اس لپے لجلجھ ٹھیکھڑے سے بھی نہیں ہوئی تھی جو اپر سے گزرتی ہوئی چیل کے پنجوں سے گر کر عین خندق کے اندر گرا تھا۔ پاں خرابی یہ ہوئی کہ جب مرزا صاحب ٹھیکھڑے کو باہر پھینک کر خندق سے نکل رہے تھے تو پیش کار صاحب میں اس وقت اس طرف سے گز رے۔ مرزا صاحب کے مٹی میں ائے کپڑوں کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے ”مرزا صاحب میں پھر کہتا ہوں کہاب یہ خندق بند کر دو۔“

مرزا صاحب نے پھر ہنس کر بات نال دی اور مونڈھے پر بیٹھ کر خاموشی سے حصہ پینا شروع کر دیا مگر اس روز جانے انہیں کیا ہو گیا حالانکہ اس روز بھی کوئی ایسی نئی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ بس یہی تو ہوا تھا کہ پیش کار صاحب حسب معمول گزرتے گزرتے رکے خندق کو دیکھا اور بہتے لگے جب خوب ہنس چکے تو کہنے لگے ”مرزا صاحب اب فرماؤ جی میں نہ کہتا تھا کہ خندق بند کر دو۔ سن لیانا۔“

مرزا صاحب نے حصہ پیتے پیتے خاموشی سے پیش کار صاحب کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جب وہ گزر گئے تو اخباروں میں مونڈھے پر چھوڑ کر اٹھنے اور اندر چلے گئے۔ مرزا صاحب کا معمول ہمیشہ یہ رہا کہ صبح ہوئی اور وہ حصہ تازہ کرہا تھا میں سنجال اندر سے برآمدے سے مونڈھا تھا باہر احاطہ میں آٹھنے۔ گرمی کے دن ہوئے تو چھاؤں میں جاڑے ہوئے تو دھوپ میں مونڈھا بچھایا۔ حصہ سامنے رکھا اور گزرتے ہوئے ہا کرسے اردو کا اخبار لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔ جب کہیں دو پھر ہوئی تو اندر چلے گئے مگر آج تو وہ باہر

اکر بیٹھے تھے کہ اخبار کی ایک ڈیرہ خبر کو دیکھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اندر چلے گئے شاید پیش کار صاحب کی بات سے ان کی طبیعت مخفض ہو گئی ہو یا شاید ان کی طبیعت ہی خراب ہو۔

مرزا صاحب دوپہر بعد کہیں پھر باہر آئے مگر ابھی موئذن ہے پر بیٹھے ہی تھے کہ انہیں بدبو آنی شروع ہوئی۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں سے بو آ رہی ہے آخر انہوں نے خندق میں جھانکا کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مرد ہوا چوہا پڑا ہے۔ سخت بے مزہ ہوئے بھاگ دوڑ کر کے لا لو مہترانی کو گھیر اور اس سے چوہا لکلوایا۔

جب چوہا نکال پھینکا گیا تو مرزا صاحب خندق کو نکلی باندھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے نذر کو بدل کر کہا ”نذر اس خندق کو پاٹ دو۔ اب یہ نجس ہو گئی۔“

دوسرے دن صبح کو پیش کار صاحب معمول کے مطابق کوارٹر کے سامنے رکے۔ مگر وہ کچھ ٹھنک سے گئے۔ خندق کیجھ بند ہو چکی تھی۔ اس روز مرزا صاحب سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ آنکھ سے آنکھ نہیں ملی۔ بس پیش کار صاحب گزری گئے۔

پیش کار صاحب کا معمول جاری ہے۔ وہی صبح صبح گھر سے نکلا اور ڈاکٹر صاحب کی دکان کی طرف چل پڑتا۔ کبھی اس گھر پر رک کر اس سے بات کرتا۔ کبھی اس گھر پر تھہر کر اس سے گفتگو کرتا۔ ہاں اب وہ مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے نہیں رکتے۔ مرزا صاحب اب بھی روز صبح کو موئذن ہابچھا کر اور حق سامنے رکھ کر اخبار ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں مگر خندق اب وہاں نظر نہیں آتی۔ جہاں خندق تھی وہاں اب چھوٹی چھوٹی گھاس اگی ہوئی ہے۔

